دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماھنامہ
الحق
زیرسرپرستی: شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

لہٗ دعوۃ الحق
قرآن وسنّت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم : ۴ فون نمبر رہائش : ۲

ماهنامه الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر : ۱۴ نومبر ۱۹۷۸ء
شمارہ نمبر : ۲ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ

اس شمارے میں

بدل اشتراک

پاکستان میں سالانہ -/۲۰ روپے ۔ فی پرچہ دو روپے
بیرون ملک سالانہ عام ڈاک سے ۳ پونڈ ۔ ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش آغاز

قومی اتحاد ملک میں اصلاح معاشرہ کی تحریک چلا رہی ہے۔ اصلاح معاشرہ ایک ایسا بنیادی اور اہم فریضہ ہے جسکی طرف قیام پاکستان کے پہلے ہی دن توجہ دینی چاہئے تھی، مگر افسوس کہ ہم نے اسلام کا نام تو بہت زور شور سے استعمال کیا مگر نظام اسلام کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے اور اس کے لئے فضا اور ماحول کو ہم آہنگ کرانے سے غفلت کو شعار بنائے رکھا حالانکہ اصلاح معاشرہ اور دعوت الی المعروف اور نہی عن المنکر کا کام کوئی وقتی اور ہنگامی نہیں بلکہ اس امت کے خیر الامم ہونے کی ما بہ الامتیاز ذمہ داری تھی۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر ——— اس طرح امت محمدیہ کا امۃً وسطاً کہلانے کی وجہ بھی یہی ہے، کہ یہ شہداء علی الناس ہے —— یعنی ساری بنی نوع انسانیت کیلئے قولی وعملی اور انفرادی واجتماعی زندگی کے ذریعہ حق وصداقت اور خیر و بھلائی کی گواہ ثابت ہوگی۔ یہ شہادت علی الحق کا کام جتنی اہمیت کا متقاضی تھا۔ اتنا ہی ہم نے اسے گریز دغفلت اور فرار و نسیان کا مستحق ٹھہرا دیا۔ نتیجہ عظیم اخلاقی تباہی، معاشرتی بحران معاشی اضطراب اور دینی زوال و اضمحلال کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسلام تعمیر انسانیت کے لئے اندرونی انقلاب برپا کرتا ہے۔ جب زمین اندر سے تیار نہ ہو تو وہ ہرگز برگ و بار نہیں لاسکتی، تزکیہ نفس، تطہیر اخلاق اور اندرونی احساس و شعور جب تک پیدا نہیں ہوگا نہ تو قانون کے آہنی شکنجوں سے انسان کی حیوانی صفات کا بے لگام گھوڑا قابو میں آئے گا نہ طبقاتی تفاوت کے ختم کرنے کے نام پر سوشلزم، کمیونزم کے خوشنما ناموں سے انسان انسان بنے گا۔ نہ مغربی تہذیب کی چمک دمک انسان کے قلب و ذہن کو منور کرسکے گی۔ اس وقت جبکہ طویل غفلت کیشی کے بعد اصلاح معاشرہ کے کام کو توجہ دی گئی ہے۔ تو ضرورت ہے کہ اس اہم فریضۂ امت اور فرض منصبی کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر منضبط کیا جائے۔

مثال کے طور پر معاشرہ خواہشات نفس، ذنوب و آثام کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ، مرگ و غم کے جاہلانہ ناقابل برداشت رسم و رواج کے آہنی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ قتل و قتال اور بغض و عداوت کا عفریت کئی کئی نسلوں تک سوہان روح بنا رہتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر ہر شہر اور دیہات کے علماء، صلحاء، معززین و شرفاء اجتماعی طور پر اصلاحی کمیٹیاں تشکیل دیں اور اسے اپنے زیر اثر حلقوں اور علاقوں میں اصلاح رسومات اور صلح ذات البین کا ذریعہ بنادیں اور اخلاص وللّٰہیت۔ درد و سوز، منت و سماجت، ترغیب و ترہیب کے ذریعہ ظلم و ستم اور عرف و رواج کی چکیوں میں پستے ہوئے انسانوں کی عافیت کا سامان پیدا کردیں اور جو بھی جماعتیں اسلام کی دعویدار یا علمبردار ہیں سب کی سب اپنے سیاسی اور جماعتی کاموں میں اصلاح معاشرہ کے کام کو بنیادی جگہ دیدیں۔

★

امریکہ کے قصبہ جونز ٹاؤن (گی آنا) میں پیپلز ٹمپل فرقہ کے پیروؤں نے اجتماعی خودکشی کر لی۔ ہزار سے اوپر مسخ شدہ سڑی گلی انسانی لاشیں مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کا منہ چڑا رہی ہیں، بیسویں صدی کی مہذب و متمدن انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی ہے، آخر مادیت اور مادی آسائش و آلائش کی کونسی چیز ہے۔ جو مغرب کی مادہ پرست تہذیب نے ان لوگوں کے لئے مہیا نہیں کی مگر پھر بھی روحانیت سے عاری یہ انسان کسی حقیقی چین اور ابدی سکون و عافیت کے لئے سرگرداں و حیران رہا۔ اور اس طلب و تشنگی کو ایک سفاک و سنگدل انسان نے زہر کے پیالوں سے دور کرنا چاہا، کیا خدا بیزار تہذیب مغرب سے اجتماعی بغاوت کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال مل سکتی ہے۔ زندگی سے فرار و گریز کا یہ انتہائی اقدام اور اجتماعی موت پیپلز ٹمپل فرقہ کی نہیں بیسویں صدی کی خدا فراموش اور خود فراموش تہذیب کی موت ہے۔ یہ پورے مغرب کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اور اس صدی کی پوری انسانیت کی موت ہے پھر ہے کوئی مردِ حق جو عصر حاضر کے اس بے چین و مضطرب انسان کو موت کی وادیوں سے ابدی حیات اور دائمی عافیت و سکون کی جنتوں کی طرف کھینچ لائے کہ جنت کے دروازے تو کھلے ہیں مگر انسان زہر کا متلاشی ہے۔ اور وہ پروانوں کی طرح جلتی ہوئی آگ اور بھڑکتے ہوئے لاووں کی طرف لپک رہا ہے۔ اسی امت کے قائد اور امام علیہ الصلوٰۃ والسلام تو ایک ایک انسان کی طرف لپک لپک کر اسے بچانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ —

وانا آخذ بحجزکم۔ (الحدیث)

★

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملک پر لہو و لعب اور سیر و تماشا کا ٹڈی دل حملہ آور ہے۔ آج کرکٹ ہے۔ کل ہاکی کا میچ والی بال اور فٹ بال، ٹیموں پر ٹیمیں آرہی ہیں، کھیل کود کی شوقین یہ قوم ہر گوشہ ہر خوشی سے دیوانہ ہو ہو کر اچھل کود رہی ہے۔ کچھ میدانوں کے گرد جمع ہوتے ہیں تو کچھ گھروں میں بند کمروں میں ٹی وی کے سامنے ڈٹ گئے ہیں۔ زندگی کا کوئی فریضہ اور تقاضا، سعی و عمل کا کوئی مطالبہ انہیں جھنجھوڑ کر اس کھیل تماشے سے الگ نہیں کر سکتا، "پھر فتح ہو" جاتی ہے تو بڑے چھوٹے سب پاگل ہو کر تالیاں بجاتے ہیں۔ نذرانے اور منتیں پوری کی جاتی ہیں پورے ملک کیلئے چھٹی کا اعلان کر دیا جاتا ہے، گویا کہ یہ فتح سومنات کی فتح تھی یا ہم نے لال قلعہ پر جھنڈا گاڑ دیا، یا پھر بیت المقدس کو ذلیل و مقہور یہودیوں سے چھڑا لیا ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قوم کے تعطل اور جمود اور لامقصدیت کی اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے جس کا مظاہرہ ہم دنیا کی زندہ قوموں کے سامنے کر رہے ہیں، واقعی جو بدبخت قوم جہانبانی اور جہانگیری کے میدانوں میں ذلت و ادبار اور شکست و فرار کی عادی بن جائے وہ اپنے دلوں کو ایسی ہی طفلانہ حرکتوں سے بہلایا کرتی ہے۔

★

پچھلے دنوں ملک وبیرون ملک علمی و دینی حلقوں میں کئی حضرات کی وفات سے ایک خلا پیدا ہو گیا۔

۲۰ر اکتوبر کو مشہور اور بزرگ علمی و ادبی شخصیت علامہ عبدالعزیز المیمنی نے داغِ مفارقت دیا، موصوف علوم عربیہ بالخصوص ادب عربی میں یگانہ روزگار اور ماہر فن استاد کی حیثیت سے متعارف تھے ان کی قابلیت کا غلغلہ اس تختی برِّ اعظم کے علاوہ عالمِ عرب تک جا پہنچا۔ موصوف نے بڑی عمر پائی مگر آخر وقت تک علم و ادب کی خدمت اور مطالعہ و تدریس میں لگے رہے۔ حق تعالیٰ ملّتِ مسلمہ کو ان کا بہترین بدل عطا فرما دے، ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

★

اردن کے مشہور ادیب ممتاز عالم علامہ تیسیر الظبیان نے بھی کاسۂ موت پی لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف کی وفات دل کے دورے سے ہوئی ساری زندگی عالمِ عرب کی دینی، علمی و ادبی خدمات میں گذری۔ اولاً دمشق سے الجزیرہ کے نام سے مجلہ شائع کروایا پھر وفات تک الشریعۃ کے نام سے پرچہ نکالتے رہے کئی اسلامی معاہد و مدارس کو چلاتے رہے۔ رابطہ کے اسلامی اور ثقافتی اجتماعات کے بھی ممتاز ممبر تھے۔ کراچی کی ایشیائی کانفرنس میں شرکت ایسے اجتماعات میں غالباً ان کی آخری شمولیت تھی وہ عالمِ اسلام کے مخلص اور مجاہد علماء میں سے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرما دے۔

★

اسی اکوڑہ خٹک میں ایک بزرگ شخصیت حضرت مولانا بادشاہ گل بخاریؒ نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا وہ اپنے بزرگ صاحب رشد و اصلاح والد مرحوم کے مسند نشین بھی تھے اور اپنے قائم کردہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے مہتمم اور منتظم بھی، وعظ و تبلیغ درس و تدریس اور اصلاح و سلوک ان کا مشغلہ رہا، حق تعالیٰ جانے والے تمام اکابر علم و فضل کے فیوضات و برکات کو جاری و ساری رکھے، اور اس قحط الرجال میں ملّتِ مسلمہ کی خزانۂ غیب سے دستگیری فرمائے۔ آمین۔

★

اکثر قارئین کو اخبارات ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ ملک کی ممتاز تعلیم گاہ پشاور یونیورسٹی نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ بانی دارالعلوم حقانیہ و سرپرست ماہنامہ الحق کو ان کی نمایاں تعلیمی معاشرتی اور سماجی خدمات کے اعتراف کے طور پر الہیات اور مذہبیات کی سب سے بڑی علمی ڈگری ۔ ڈاکٹریٹ ۔ عطا فرمائی (جس کی رپورٹ شاملِ اشاعت ہے۔) گو حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ جیسے اصحاب فضل اور ارباب علم کی شخصیتیں ایسے رسمی اعزازات سے بلند و بالا ہوتی ہیں تاہم ناسپاسی ہوگی اگر پشاور یونیورسٹی کی اس قدر شناسی اور علم و فضل کی قدر افزائی پر اسکا شکریہ ادا نہ کیا جائے۔

سمیع الحق

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

شفیق فاروقی

دارالعلوم کے شب و روز

پشاور یونیورسٹی کی طرف سے

حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کی خدمت میں

ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری

(خصوصی تقریب کی چشم دید رپورٹ)

۲۱ اکتوبر مطابق ۲۸ ذیقعدہ کا دن متعلقین دارالعلوم حقانیہ کے لئے خصوصاً اور ملک کے دینی و علمی حلقوں کے لئے عموماً خوشی اور اعزاز و افتخار کا دن رہے گا کہ آج پاکستان کے ممتاز ترین تعلیمی مرکز پشاور یونیورسٹی نے دارالعلوم حقانیہ کے بانی و مہتمم حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کی خدمت میں ان کے شاندار تعلیمی خدمات اور امتیازی کارناموں کے اعتراف کے طور پر ڈاکٹریٹ کی ممتاز ڈگری پیش کی۔ پشاور یونیورسٹی پچھلے سال ڈیڑھ سال سے یہ فیصلہ کر چکی تھی مگر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ اپنی طبعی افتاد کی بناء پر یونیورسٹی کی اس خواہش کو ٹالتے رہے مگر اس دفعہ اصرار کی بناء پر آمادہ ہوگئے۔ یہ تقریب یونیورسٹی کے وسیع اور شاندار کانوکیشن ہال میں منعقد ہوئی۔ جو یونیورسٹی کے طلباء و طالبات، ممتاز دانشوروں، سکالروں، پروفیسروں اور حکومت کے اہم شعبوں کے سربراہوں اور معزز مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ تقریب کی صدارت صوبائی گورنر لفٹیننٹ جنرل فضل حق صاحب نے کی جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں۔ رواج کے مطابق حضرت شیخ الحدیث کو گورنر اور سنڈیکیٹ کے ممبران کے ساتھ جلوس کی شکل میں ڈائس پر لانا تھا مگر آپ کی ضعف و علالت کی بناء پر پہلے ہی سے آپ کو ڈائس پر بٹھا دیا گیا۔ اس موقع پر حضرت شیخ الحدیث کے علاوہ ایک نامور جرمن مستشرق خاتون ڈاکٹر اینی میری شمل کو بھی ڈگری دی گئی جنہیں مشرقی علوم بالخصوص مولانا رومی اور اقبالیات پر دسترس حاصل ہے۔ ڈگری دینے سے قبل پشاور یونیورسٹی کے علم دوست وائس چانسلر جناب اسمٰعیل سیٹھی صاحب نے حضرت شیخ الحدیث کے مختصر مطبوعہ سوانح اور خدمات سے انگریزی میں روشناس کیا اور کہا کہ

"مولانا عبدالحق حقانی نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر اپنے بزرگوں سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ موصوف مجاہد حاجی صاحب ترنگ زئی سے بھی فیض حاصل کیا۔ درس نظامی کی سند دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی۔ پھر بطور مدرس اپنے مستقبل کا آغاز دیوبند سے کیا۔ اور ہزاروں طالب علموں نے وہاں مولانا سے فیض حاصل کیا۔ مولانا صاحب نے ۴۷ء میں دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے

بہت سی اسلامی کتابیں لکھیں۔ مولانا صاحب سوشل ریفارمر (سماجی مصلح) کی حیثیت سے بھی بہت خوب پہچانے جاتے ہیں۔ مولانا صاحب کی خدمات اسلام کی تدوین و ترویج معاشرے کی اصلاح اور تعلیمی ترقی میں بہت نمایاں ہیں۔ مولانا عبدالحق صاحب کی ان گوناگون ناقابل فراموش خدمات کو دیکھتے ہوئے سنڈیکیٹ آف پشاور یونیورسٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ مولانا صاحب (DOCTOR OF DIVINITY) (ڈاکٹر الٰہیات) کی ڈگری پانے کے مستحق شخصیت ہیں ؛؛

اس کے بعد صوبائی گورنر لیفٹیننٹ جنرل فضل حق صاحب نے مختصر الفاظ میں مولانا مدظلہ العالی کو خراج تحسین پیش کیا اور مصافحہ کے بعد مولانا کو چاندی کے منقش کیس میں ڈگری پیش کی۔ اور ہال حاضرین کے زبردست تالیوں سے کافی دیر تک گونجتا رہا ۔۔۔ اس کے بعد منتظمین کی خواہش پر مولانا مدظلہ نے حسب ذیل مختصر تقریر فرمائی۔ اور دعائیہ کلمات سے اختتام کے بعد گورنر صاحب نے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔ مولانا کی تقریر یہ ہے :۔

تقریر

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔۔۔ محترم بزرگو! میرے پاس الفاظ نہیں کہ چانسلر صاحب، وائس چانسلر صاحب، سنڈیکیٹ کے ممبران، اساتذہ، طلبہ اور آپ سب حاضرین کا شکریہ ادا کر سکوں کہ مجھ جیسے ادنیٰ ترین طالب علم کو ایسے اونچی جگہ پر جہاں علماء اور فضلاء کا اجتماع ہے اور جو پاکستان کے ممتاز اور عظیم تعلیمی یونیورسٹی ہے حاضر ہونے کا موقعہ دیا اور ایسے اعزاز سے نوازا۔ حضرات یہ علم کا مرکز ہے ہم اور آپ سب طالب علم ہیں اور علم کو اللہ نے بڑی فضیلت دی ہے ہم سب کے دادا حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ بنایا تو علم کی وجہ سے، وہ اپنے وقت کے سائنس کے بھی عالم تھے وعلم آدم الاسماء کلھا ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو حقائق و خواص اشیاء کا علم دیا۔ سائنس بھی حقیقتوں کا موجد نہیں ہے مظہر ہے۔ مخفی چیزوں سے پردہ ہٹانا اس کا کام ہے انکشاف و ظہور۔ اصل کام تو اللہ تعالیٰ کا ہے جو ہر چیز کے موجد ہیں۔ علماء نے کہا ہے کہ موجودہ زمانے کی سائنس سے قرآن کی تائید ہو رہی ہے پہلے جب کہا جاتا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج آسمانوں کی طرف گئے تو یہ فلاسفر مذاق اڑاتے تھے مگر جدید سائنس نے ثابت کر دیا کہ انسان جب چاند ستاروں، زہرہ اور مریخ تک پہنچ سکتا ہے تو ایک نبی روحانی اور خدائی طاقت کے ذریعہ آسمانوں سے بھی یقیناً اوپر جا سکتا ہے ۔ جب کہا جاتا کہ عرش معلیٰ کی بات حضور اقدس سن رہے ہیں تو لوگ مذاق اڑاتے کہ مولوی کیسی بات کرتا ہے مگر اب راکٹ میں سوار فلکیات کے اونچے مقامات پر چاند پر جانے والے افراد کو زمین سے ہدایات دی جاتی ہیں۔

محترم بزرگو! علم ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی اہمیت وحی متلو یعنی قرآن مجید سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا سب سے پہلا لفظ اقراء ہے یعنی پڑھ، اللہ کا نام لے کر پڑھ۔ قرآن مجید میں وحدانیت کا مسئلہ بھی ہے، معاشیات کا بھی مسئلہ ہے۔ اخلاقیات بھی ہیں مگر اللہ کا پہلا فرمان ہے :۔ اقراء باسم ربك الذی خلق (الآیۃ) ۔۔۔ اور اسی علم کی وجہ سے طالوت کا انتخاب ہوا تو مخالفین

نے کہا کہ یہ تو کم تر قبیلے والا ہے اور غریب ہے اس کو خلافت کیسے دی گئی ؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم — علم میں اللہ نے انہیں وافر حصہ دیا تھا تو معلوم ہوا کہ مدارِ فضیلت اور مدارِ خلافت علم ہے بسطۃ فی العلم۔ خداوند کریم ہمیں توفیق دے کہ ہم سب اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی علم حقیقی قرآن مجید کے مطابق کردیں۔

محترم بھائیو اور بزرگو! اگر دین آگے آئے گا تو یقیناً ہر چیز مسخر ہو جائے گی۔ واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ دریائے نیل ہر سال خشک ہو جاتا تھا مسلمانوں نے قبضہ کیا تو دیکھا کہ ایسے موقعہ پر لوگ جاہلیت کی رسم کے مطابق ایک نوجوان خوب صورت عورت کو اچھے کپڑے پہنا کر دریا کی گہرائیوں میں ڈبو دیتے تھے۔ جان کا نذرانہ پیش کرتے کہ دریا چڑھ جائے۔ حاکم وقت حضرت عمرو بن العاص کو بتایا گیا تو فرمایا ہم تو اسلام کے ماتحت حکومت چلا رہے ہیں مجھے دیکھنا ہے کہ ایسا کرنا اسلام میں جائز ہے یا ناجائز۔ تو حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی گئی۔ کہ یہاں ایسا جاہلانہ رسم جاری ہے۔ حضرت عمرؓ نے دریائے نیل کے نام ایک مختصر چٹھی لکھ کر بھیجدی لکھا کہ ان كنت تجري بامر الله فاجر والا فلا حاجة لنا اليك اگر اللہ کی مرضی سے چلتا ہے تو بہتے رہو ورنہ ہمیں کوئی حاجت نہیں چٹھی کو دریا میں ڈالا گیا تو اسی وقت دریائے نیل میں طغیانی آگئی۔ حضرت علاء حضرمیؓ صحابی ہیں فوج کے ساتھ ایسے علاقے میں پھنس گئے جہاں پانی نہ تھا لوگ پیاسے تھے وضو کا انتظام نہیں تھا فرمایا تیمم کر کے نماز پڑھو اور اللہ کی بارگاہ میں دعا کرو کہ یا اللہ ہم آپ کی راہ میں دین کی اشاعت اور مضبوطی کے لئے لڑ رہے ہیں یا اللہ ہمیں پانی عطا فرما۔ اسی وقت زمین سے پانی کے چشمے ابل پڑے۔

تو دین مخدوم ہے اور دنیا خادم ہے اس دین کے لئے اللہ اور اللہ کے احکام اور رسول اللہؐ کے احکام ماننے کے لئے اللہ نے حضورؐ کو بھیجا اگر اس کی پیروی کی جائے تو یقیناً یقیناً ہر چیز ہمارے لئے مسخر ہو جائے گی وسخر لكم ما في الارض جميعا ہر چیز مسخر ہو گی۔

محترم بھائیو! ایک وقت وہ تھا کہ عوام دین کو چاہتے تھے مگر حکومت انگریزوں کی تھی وہ نہیں چاہتی تھی، ہندو نہیں چاہتے تھے کہ دین آجائے یا بو حکمران نہیں چاہتے تھے مگر اب تو اللہ تعالیٰ نے فضل کیا ہمارے جنرل ضیاء الحق صاحب اور حکومت کے دیگر زعماء اور لیڈر سب اپنی تقاریر کا آغاز بسم اللہ سے کرتے ہیں اور اسلام کا ذکر کرتے ہیں۔ استحکام دین اور دین پہ چلنے کی ہدایات دیتے ہیں کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں دین کو اپنایا جائے۔

تو فضا بہت سازگار ہے اور انشاء اللہ یہی آپ لوگ جو فضلاء ہیں اور جو طلباء ہیں اور منتظر ہیں آگے چل کر کرسیوں پر بیٹھیں گے، باگ ڈور سنبھالیں گے تو آپ لوگ دین سے آراستہ ہو کر دین کی بڑی خدمت کر سکیں گے۔ اور اگر دین کی خدمت کریں گے تو انشاء اللہ یہ پاکستان بھی مستحکم ہو گا تمہاری بات کا بھی وزن ہو گا اور اقوام عالم میں تمہاری قدر ہو گی۔

آخر میں یہ گناہ گار ایک بار پھر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہے جس کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ کہ مجھ جیسے بوڑھے بیمار گمنام شخص کو یہاں کھینچ لائے اور اتنے بڑے اعزاز سے نوازا۔ وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

دارالعلوم حقانیہ میں شکریہ کی تقریب حضرت شیخ الحدیث کے اعزازی ڈگری کی خبر سے دینی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور گوشے گوشے سے مبارکباد کے پیغام آنے لگے کہ یہ صرف حضرت شیخ الحدیث کا نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء بلکہ درس نظامی کے ہر فارغ التحصیل عالم کی علمی عظمت و اہلیت کا اونچی سطح پر ایک اعتراف تھا۔ اس سلسلہ میں ۲ر نومبر کو دارالحدیث میں طلباء و اساتذہ دارالعلوم حقانیہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں ایک طرف حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو مبارکباد دی گئی۔ اور دوسری طرف ایک قرارداد کی شکل میں پشاور یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد، وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ کے تمام ممبران کو علوم دینیہ کی اس قدرشناسی پر زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور اسے دارالعلوم حقانیہ اور پشاور یونیورسٹی کے باہمی علمی روابط کے استحکام کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اس موقعہ پر مولانا سمیع الحق صاحب۔ مولانا عبدالحلیم صاحب صدر المدرسین اور مولانا محمد علی صاحب اساتذہ دارالعلوم نے خطاب کیا۔ اس تقریب میں دارالعلوم حقانیہ کے دورۂ حدیث کے طالب علم مولانا سعید الرحمان نعمانی کو جو پچھلے سال پورے ملک میں وفاق المدارس کے امتحانات میں فسٹ آئے، مبارکباد دی گئی اور دارالعلوم کی طرف سے گرانقدر کتابوں کا تحفہ بطور انعام دیا گیا +

مجلس شوریٰ کا جلسہ ۲۹ر نومبر۔ دارالعلوم حقانیہ کی مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس جدید کتب خانہ کے شاندار ہال میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت ریٹائرڈ کرنل عبدالجبار خان صاحب مروان نے کی۔ اجلاس میں ملک بھر سے دارالعلوم کے ارکان شوریٰ نے شمولیت کی۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد دارالعلوم کے بانی و شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے اپنی دعائیہ کلمات سے اجلاس کا افتتاح فرمایا۔ آپ نے دارالعلوم سے وابستہ وفات پانے والے بعض اراکین۔ معاونین اور علمی دنیا کے اہم دینی و علمی شخصیات کی وفات پر دعائے مغفرت کی اور اظہار تعزیت کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کی ضعف و علالت کی وجہ سے مولانا سمیع الحق صاحب نے سالانہ کارگذاری مصارف اور مدات آمدنی وغیرہ پر مفصل رپورٹ پیش کیا۔ آپ نے کہا۔ کہ سال گذشتہ دارالعلوم کو مختلف مدات سے چھ لاکھ اٹھاون ہزار اکیس روپے اکسٹھ پیسے کی آمدنی ہوئی جبکہ مختلف تعلیمی و تنظیمی اور تعمیری شعبوں پر پانچ لاکھ ترپن ہزار نوسو ننانوے روپے اٹھتیس پیسے خرچ ہوئے۔

سال رواں کیلئے آپ نے سات لاکھ ستر ہزار چھ سو اناسی روپے تینتیس پیسے کا میزانیہ پیش کیا۔ زیر نظر میزانیہ میں فنڈ کی رو سے اگرچہ دو لاکھ انتیس ہزار تین سو انیس روپے کا خسارہ تھا۔ مگر اجلاس نے توکلاً علی اللہ متوقع آمدنی کی رو سے میزانیہ کی منظوری دی۔ ارکان شوریٰ نے دارالعلوم کے ہر شعبہ کے بڑھتے ہوئے ترقیات پر خداوند تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا مجلس شوریٰ نے حضرت شیخ الحدیث صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے پر پشاور یونیورسٹی کے اس اقدام کو سراہا، اور قابل تقلید قرار دیا۔ اجلاس کئی گھنٹے جاری رہنے کے بعد دعا پر اختتام پذیر ہوا۔

مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ — کہ فکر مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمدؒ — کہ محض مقتدیٔ سنتِ پیمبر ہے
زمیں کو مہرِ فلک سے نہ کیوں ہو دعویٰ نور — کہ اُس کا رایتِ اقبال سایہ گستر ہے
عروجِ سنگِ درِ قصرِ جاہ یہ کہ جسے — ہزار طعنِ حضیض اوجِ لامکاں پر ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد — جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
شرف ہے مہر کو اس کے زمانے سے دم دم — زبسکہ روز و شب انصاف سے برابر ہے
وہ بادشاہِ ملائک سپاہ، کوکبِ دیں — کہ نورِ شمس و قمر جس کی گردِ لشکر ہے
وہ شعلہ خصلتِ الحاد سوز، کفر گداز — کہ جس کا نقشِ قدم مہر روزِ محشر ہے
وہ برقِ خرمنِ اربابِ شرک و اہلِ ضلال — کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہرمانِ فلک توسن و نجوم حشم — کہ ترکِ چرخ غلام اس کا مہر چاکر ہے

وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جس کا سالِ خروج
"امامِ برحق مہدی نشاں علی فر" ہے
۲ ۴ ۲ ۱ ۵

جو سیّد احمدؒ امامِ زمان و اہلِ زماں — کرے ملاحدۂ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا — "خروجِ مہدیٔ کفار سوز کلکِ تفنگ"
۲ ۴ ۲ ۵ ۲ ۱

حکیم مومن خان مومنؒ

موصول :- مولانا ابوالحسن علی ندوی

اسلامی مباحث و تحقیقات

برصغیر کے علماء و فضلاء کا بے مثال کردار

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے دانشوروں کی کانفرنس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا بصیرت افروز خطبۂ صدارت

ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۶ اکتوبر کو لکھنؤ کی اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ انگریزی میں اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ انگریزی کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے باوجود اس میں اتنا اور ایسا تحقیقی کام نہیں ہوا جتنا اور جیسا عربی زبان میں ہوا جس کے ساتھ دنیاوی فائدوں کی کوئی امید وابستہ نہیں تھی۔

علی میاں نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا یہ فرق قدیم نظامِ تعلیم کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ یہ خطبۂ صدارت ہمیں مولانا مدظلہٗ کی طرف سے موصول ہوا ہے اور ہم اسے نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔

(ادارۃ الحق)

فضلائے گرامی! یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اسلامک سٹڈیز کانفرنس اس سال ایک ایسے ادارہ اور تعلیمی مرکز میں منعقد ہو رہی ہے جس کے متعدد بانیوں اور فضلاء نے اسلامی مباحث و تحقیقات کے میدان میں اپنے بحث و تحقیق، مطالعہ و محنت، توازن دماغی، اصابت رائے اور نظر کی گہرائی و گیرائی کے تابناک نقوش چھوڑے ہیں اور جہاں تک اردو زبان اور تحتی برّاعظم میں علمی تحقیق و جستجو کے کام کا تعلق ہے، ان کو ایک طرح سے اولیت و پیش قدمی کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے اس کے لئے وہ زبان و پیرایۂ بیان اختیار کیا جو ان علمی مباحث کے مزاج

سے پوری مطابقت رکھتا ہے، اور اس میں صحیح تناسب کے ساتھ ادب و انشاء کی وہ چاشنی بھی موجود ہے۔ جس کے بغیر اس نسل کے ان نوجوانوں کا جن کی نشو و نما ہندوستان کے گذشتہ ادب پرور ماحول میں ہوئی تھی ان خشک علمی و تاریخی مباحث کے پڑھنے پر آمادہ ہونا دشوار تھا۔ نیز ان کی نگارشات نے اس طبقہ کا اپنے عقائد و دینی مسلمات، اپنی تہذیب و تمدن اپنی تاریخ اور اپنے زبان و ادب پر اعتماد بحال کیا، اور اس میں خود داری و خود اعتمادی پیدا کی، جو ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت اور مغربی تہذیب و تعلیم کی یلغار سے مایوسی و احساسِ کہتری کا شکار تھا۔ عربی و فارسی زبانوں پر عبور رکھنے، علومِ اسلامیہ کی منظم و تفصیلی تعلیم حاصل کرنے اور ان مباحث و تحقیقات کے قدیم و مستند مآخذ پر براہِ راست نظر رکھنے اور ان سے استفادہ کر سکنے کی صلاحیت کی بنا پر ان کی تحریروں میں اصالت (ORIGINALITY) اور پختگی پائی جاتی ہے۔ اور وہ ان ناہمواریوں اور غلط فہمیوں سے بڑی حد تک پاک تھیں جو بالواسطہ مطالعہ و ترجمہ اور سکنڈ ہینڈ معلومات کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہیں اور جن سے مغرب کے بہت سے نامور مستشرقین اور ان کے تلامذہ اور خوشہ چیں محفوظ نہیں رہ سکے۔

علمی و تاریخی تحقیق اگر زبان کوئی حجاب اور عیب نہیں ہے تو کتاب خواہ کسی زبان میں ہو اسکی اصل قدر و قیمت (MERIT) مواد و مضامین، مستند معلومات، اپنی تحقیق کو ثابت کرنے کے لئے قوی علمی دلائل، صحیح تحلیل و تجزیہ، داخلی شہادتیں اور دستاویزی ثبوت ہے۔ اسکی روشنی میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی شاعری کی تاریخ اور شعرائے ایران کے تذکرہ اور نقد سخن میں مولانا شبلی نعمانی کی مایہ ناز کتاب "شعر العجم" جزیہ اور ذمیین کے حقوق کے مبحث پر ان کے فاضلانہ مضامین "الجزیۃ فی الاسلام" اور "حقوق الذمیین" ایک مشہور عوام و زبان زد خلائق، الزام کی تردید اور اسکی تاریخی حقیقت کے بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں ان کے دو محققانہ رسائل "کتب خانۂ اسکندریہ" اور "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" تاریخ نگاری اور علمی تنقید کا نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ایک معاصر و رفیق کار مولانا حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کتاب "گل رعنا" اردو شعراء کے تذکرہ میں اور "یادِ ایام" صوبۂ گجرات کی علمی، تمدنی، تعمیری، رفاہی اور اخلاقی و روحانی ترقی و شائستگی اور وہاں کے سلاطین و وزراء اور علماء و مشائخ کے تعارف میں ایک مثالی تذکرہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے طرز و اسلوب پر ہندوستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کی تاریخ لکھی جانی چاہیے تھی، اول الذکر کتاب "گل رعنا" میں انہوں نے اردو زبان و شاعری کی تاریخ و ارتقاء کے سلسلہ میں بعض نئی تحقیقات و نظریات پیش کئے ہیں۔ اور اردو کے سب سے مشہور و مقبول تذکرہ "آبِ حیات" کی جس کو ادبی حلقوں میں ماورائے تنقید سمجھ لیا گیا تھا۔ بہت سی تاریخی غلطیوں اور فروگذاشتوں

کی نشان دہی اور متعدد ناہمواریوں اور ناانصافیوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے، جن کے سلسلے میں مصنّف کتاب کا سحر نگار قلم حقیقت سے دور جاپڑا تھا۔

دوسرے دور میں مولانا شبلی کے مایۂ ناز شاگرد اور اس درسگاہ کے (جہاں اسوقت آپ جمع ہیں) نامور فاضل مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف "عرب وہند کے تعلقات" "عربوں کی جہاز رانی" اور "خیام"، بحث وتحقیق، وسیع مطالعہ، اسلامی کتب خانہ کے وسیع وعمیق سمندر کی تہہ میں سے موتی نکالنے اور خرمن علم کی ریزہ چینی کا اعلا نمونہ ہیں جن پر ہماری اردو زبان اور نئے دور کو فخر کرنے کا حق ہے۔ عمر خیام، ایران کا سرمایہ فخر اور مایۂ نازش شاعر و ریاضی داں ہے۔ لیکن خود ایران اس کے علمی کمالات کی صحیح نقاب کشائی اور علمی و تاریخی تحقیق وکاوش میں اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں پیش کرسکتا۔ اسی طرح "نقوش سلیمانی" میں اردو زبان کے بہت سے الفاظ ومحاورات کی تحقیق خاص طور پر "تہنئہ" کے سلسلہ میں جو کچھ کہاگیا ہے، اس سے تحقیقی کام کرنے والوں کو بحث وتحقیق اور غور وفکر کا مواد ملتا ہے۔ اور نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

علماء کا قائدانہ کردار یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متعدد اسلامی ملکوں کے برخلاف ہندوستان کے علماء علم وتحقیق کے قافلہ سے بچھڑنے نہیں پائے اور انہوں نے اپنے ملک کی زبان اور ادب سے ناتا نہیں توڑا، جیساکہ متعدد اسلامی اور بعض عرب ملکوں میں پیش آیا، بلکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ ان علماء نے ایک طویل عرصہ تک سیاست اور ملک کی تحریک آزادی کیطرح ان علمی وادبی میدانوں میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا، اور ادب و تنقید میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑیں جو ان کے پاکیزہ ادبی ذوق، زبان کی اداشناسی ومزاج دانی اور تنقیدی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں اور اس میدان میں خواہ ان کو ابتدائی کوششوں کا نام دیا جائے وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعر وشاعری" اور "یادگار غالب" مولانا شبلیؒ کا "موازنہ انیس ودبیر" مولانا عبدالسلام ندوی کی "شعر الہند" اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اور خواہ اس موضوع پر علم وتحقیق کا قدم کتنا ہی آگے بڑھ جائے اور اس میں کتنا ہی بیش بہا اضافہ ہو، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گیسوئے اردو کے سنوارنے اور زبان وادب کی شائستگی میں ان پیش رو مصنّفین کا احسان بھلایا نہیں جاسکتا۔

انگریزی زبان وافکار فضلائے گرامی! آپ حضرات سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے کم سے کم وسط سے عالم اسلام بالخصوص اس کے چار ملکوں، ترکی، مصر، ایران اور ہندوستان کو مغربی تہذیب مغربی تعلیم اور مغربی افکار واقدار اور فلسفوں کا رد در رد سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس میں ہندوستان کا قدم دوسرے مسلم اور عرب ملکوں سے آگے ہے کہ مغربی تہذیب اور علوم کے سب سے طاقتور دیرجوش نمائندہ برطانیہ

نے شروع ہی میں اس پر مکمل سیاسی تسلط حاصل کر لیا تھا۔ اور جب کہ مذکورہ بالا ممالک اس تہذیب و تعلیم سے بالواسطہ اور اسکی علمی و ادبی محنتوں کے ذریعے متاثر ہو رہے تھے، وہ خاص طور پر مغرب کے سیاسی، ذہنی اور علمی و تہذیبی اقتدار کی تحویل و نگرانی میں آگیا تھا۔ ہندوستانی مسلمان انگریزی کے سیکھنے اور اس کے ادب و انشاء تحریر اور خطابت و تقریر میں قابلیت پیدا کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ قصبہ قصبہ انگریزی سکولوں کے کھل جانے، بڑے شہروں میں کالجوں اور صوبوں کے مرکزی شہروں میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آرہا تھا، انگریزی اخبارات جاری ہو رہے تھے، انگریز حکام اور دانشوروں کے ساتھ صحبت و اختلاط کے مواقع مہیا تھے، انگلستان کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں بالخصوص کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرف اعلا خاندانوں اور کھاتے پیتے گھرانوں کے بہترین نوجوان بڑی تعداد میں رخ کر رہے تھے۔ وہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے اور انگریزی زبان و ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے۔

اس پر مستزاد ۱۸۷۵ء میں سر سید احمد خاں مرحوم جیسی طاقتور شخصیت کے ہاتھوں مدرسۃ العلوم کے نام سے علی گڑھ میں ایک دانش گاہ کا قیام عمل میں آیا جس میں ذہنی، علمی، اخلاقی قیادت مسٹر بیک (Mr. BECK) و مسٹر ماریسن (Mr. MORISON) اور مسٹر ارچبولڈ (Mr. ARCHBOLD) جیسے فاضل اور اثر انگیز اساتذہ اور منتظمین کے ہاتھ میں تھی، پھر ۱۹۲۰ء میں اس نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس تختی برّ اعظم کے ذہین نوجوان مسلمانوں کے لئے اس میں مقناطیس کی سی کشش تھی، جس نے خلیج بنگال سے لے کر درّہ خیبر تک کے باصلاحیت مسلمان خاندانوں کے جگر گوشوں کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیا جس طرح مقناطیس آہن پاروں کو کھینچ لیتا ہے۔ دوسری طرف اس ملک کی دینی حس اور ملی غیرت دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں، ان اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں اور میں اپنی بعض ناچیز تصانیف و مضامین میں ان کا تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں) زیادہ تیز اور طاقتور تھی جس کا ایک ثبوت تحریک خلافت میں ہندوستانی مسلمانوں کا دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور اپنی اسلامی تہذیب اور دینی شعائر پر اس سے زیادہ ثبات اور استقامت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ جتنا دوسرے ملکوں نے کیا ہے۔

یہ صورتِ حال اور یہ حقائق جن سے کوئی باخبر ہندوستانی مسلمان انکار نہیں کر سکتا، اس بات کے مقتضی بلکہ ضامن تھے کہ کم سے کم ہندوستان میں اسلام کے عقائد و اصولِ شریعت و قانون، اسلامی تہذیب و تمدن مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے دورِ قیادت و عظمت، مسلمانوں کے نظامِ حکمرانی و سیاست، اسلامی اقتصادیات اور اسلامی فلسفۂ اخلاق پر انگریزی میں کثیر تعداد میں بلند معیار کی کتابیں لکھی جائیں گی اور بحث و تحقیق، مغربی تہذیب پر تنقید اور اسلام کی ترجمانی و تشریح کے لئے انگریزی زبان کو اظہارِ خیال اور اظہارِ کمال کا ذریعہ بنایا جائے گا، اور اس پر کم وقت میں ایک وسیع کتب خانہ (LIBRARY) تیار ہو جائے گا۔ جو ایک طرف مسلمان نوجوانوں میں

خوداعتمادی و خودنگری کا جوہر پیدا کرے گا. دوسری طرف یورپ کے دانشوروں اور خاص طور سے برطانیہ کے فضلاء مصنفین و مستشرقین کو اگر اسلام کا حلقہ بگوش نہ بنا سکے گا تو کم سے کم ان کو اسلام کے سنجیدہ اور مخلصانہ مطالعہ پر آمادہ کرے گا. اور اسلامی تحقیقات (اور آج کل کی زبان میں "علمی و ادبی تخلیقات") کا ایک سیل رواں جاری ہوگا جو ان دانش گاہوں سے نکل کر سارے ملک کو سیراب کر دے گا، اور اس کی لہریں کیمبرج، آکسفورڈ، برمنگھم اور ایڈمبرا کی یونیورسٹیوں کی دیواروں سے ٹکرائیں گی، انگریزی پر عبور رکھنے والے یہ مسلمان فضلاء کم سے کم اسلامی تاریخ، اسلامی قانون اور عربی فارسی اور اردو زبان و ادب اور شاعری کی تاریخ و تنقید کے سلسلہ میں اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو خود کفیل بنا دیں گے، اور ان موضوعات کا مطالعہ کرنے والوں کو عرب و ایران کی ادبی و سیاسی تاریخ کے معلومات کے لئے کسی نکلسن (NICHOLSON) کسی براؤن (BROWNE) اور کسی ہٹی (HITTI) کی احتیاج نہ رہے گی، اور جہاں تک شریعت اسلامی کی تاریخ اور حدیث و فقہ کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے کسی گولڈزیہر (GOLD ZHER) اور کسی شاخت (SCHACHT) کی ضرورت نہ ہوگی، جہاں تک عربی ادب و شاعری قرآن کی زبان اور اس کے علوم کا تعلق ہے کسی مارگولیتھ (MARGOLIOUTH) کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا. جہاں تک اسلامی دور میں تصنیف و تالیف کی تحریک اور مسلمانوں کے آثار علمیہ اور ان کی قلمی کاوشوں کا تعلق ہے ان سے واقف ہونے کے لئے کسی بروکلمن (BROCKELMANN) کا دریوزہ گر ہونے کی ضرورت پیش نہ آئے گی. اور اس طرح مسلمان تعلیم یافتہ نوجوان نہ صرف اس ذہنی و تہذیبی ارتداد کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں گے، جو تیزی کے ساتھ ان ملکوں میں پھیل رہا تھا. جو مغرب کے زیر اقتدار تھے، بلکہ وہ مغرب میں اسلام کی تبلیغ، قرآن مجید اور سیرت نبوی سے متعارف کرانے اور اسلام کے چشمۂ حیات پر لانے کا ذریعہ بھی بن سکیں گے.

سارے دلائل و قرائن اس بات کے حق میں تھے کہ ہندوستان میں اسلامیات پر تحقیق و تصنیف کا ایک نیا دور شروع ہوگا، انگریزی زبان ان بلند معیار کتابوں سے مالا مال ہو جائے گی، جو زبان کی شیرینی و دلآویزی استدلال کی مضبوطی، مواد کے حسن ترتیب اور پیش کرنے کے سلیقے کی بنا پر اہل زبان کے لئے بھی دلکشی و دلچسپی کا سامان رکھتی ہونگی.

لیکن مجھے آج اس مؤقر مجلس میں جس میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے چیدہ فضلاء اسلامیات اور السنۂ شرقیہ کے معلم و ناقد جمع ہیں، اپنے اس تاریخی و علمی استعجاب کے اظہار کی اجازت دیجئے کہ ہندوستان کا ایک دیانتدار اور وسیع النظر مورخ یہ معلوم کر کے حیران رہ جاتا ہے کہ یہ توقع پوری نہیں ہوئی، اگر ہم ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم و تحصیل کی تاریخ ۱۸۵۸ء کی بجائے جب ہندوستانی مسلمان ہمہ گیر شکست سے دوچار اور انگریزوں کے پے در پے فتوحات سے سراسیمہ و بدحواس ہو رہے تھے، ۱۸۷۵ء سے شروع کریں

جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (M.A.O. College) کی بنیاد پڑی اور اس کو احتیاطاً ۱۹۷۵ء پر ختم کر دیں، تو ایک پوری صدی کی مدت جس میں تنہا ایم۔ اے۔ او کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایسے فضلاء بھی پیدا کئے جن کی دینی حمیت معروف اور جن کا انگریزی زبان پر اہل زبان کی طرح عبور مسلّم و مشہور رہے، صرف اتنی کتابیں بھی انگریزی زبان میں پیش نہیں کر سکتی ہے جو انگلیوں پر گنی جا سکیں۔ ہمیں انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی کے دو تین مصنّف سے زیادہ نہیں ملتے جنہوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب و تاریخ پر ایسی کتابیں لکھیں جو اہل مغرب سے اپنے مصنّفین کی زبان دانی کا لوہا منوا سکیں یا اپنے مواد و مضامین اور ان کو پیش کرنے کے طریقے سے اہل مغرب کو متاثر کر سکیں۔

اسلام پر کام | ان میں سرفہرست نام رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی کا ہے جن کی کتاب اسپرٹ آف اسلام (SPIRIT OF ISLAM) نے (جس کے سارے خیالات و نتائج بحث سے اتفاق کرنا مشکل ہے) انگلستان کے علمی و ادبی حلقہ سے خراج تحسین وصول کیا، اور بہت سے ذہین اور فاضل نوجوان اس کو پڑھ کر اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ ان کی دوسری کتاب History of the Saracens اپنی زبان کی سلاست، تحریر کی شگفتگی اور توازن کی وجہ سے عرصہ تک مقبول اور متداول رہی۔ دوسرا ہندوستانی مسلمان مصنّف جس کی کتابوں سے باہر کی دنیا متعارف ہے، صلاح الدین خدابخش ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے بہت سے خیالات سے اسلام کا صحیح علم رکھنے والے فضلاء کو شدید اختلاف پیدا ہوا۔ اس بات میں ان سے بڑھ کر مولوی محمد علی لاہوری امیر جماعت احمدیہ لاہور اور خواجہ کمال الدین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جن کی کتابیں کسی زمانہ میں اسلام کے سمجھنے کا واحد ذریعہ سمجھی جاتی تھیں، لیکن جمہور مسلمین و مسلک اہل سنّت سے ان کی علیحدگی اور اوّل الذکر (مولوی محمد علی لاہوری) کے مجتہدانہ خیالات مغربی فلسفہ اور علم طبیعیات (جو ابھی دور طفولیت میں تھا۔) سے ضرورت سے زیادہ مرعوبیت اور غیبی حقائق معجزات انبیاء اور ماورائے عقل بیانات کی دور از کار تاویلات اور ان کو عصری معلومات اور طبعی اصولوں کے مطابق بنانے کی پر تکلف کوشش نے ان کتابوں کی دینی و علمی قدر و قیمت کو مجروح کر دیا۔ پھر یہ کتابیں سب مدافعانہ انداز اور معذرت آمیز لہجہ میں لکھی گئی تھیں جو ہمیشہ کمزور اور غیر مؤثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اگر کسی ایسے بلند پایہ مصنّف کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے انگریزی میں کوئی ایسا کام کیا جس نے باہر کی دنیا کو متوجہ کر لیا اور مغربی فضلاء نے اس سے استفادہ کیا اور اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دئے تو وہ علامہ اقبال اور علامہ عبداللہ یوسف علی ہیں۔ اوّل الذکر کی شہرۂ آفاق کتاب الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید (Reconstruction of Religious Thought in Islam) ہے جو ان کے مدراس کے خطبات کا مجموعہ ہے۔ اور جو اپنے بعض تفردات کے باوجود ایک فکر انگیز اور پُر مغز کتاب ہے۔ اور جس کو مغرب کے چوٹی کے

دانشوروں نے اہمیت دی اور اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے۔ اور ثانی الذکر کا ترجمہ قرآن مجید اپنی ادبیت، موسیقیت اور زورِ بیان کی بدولت یورپ وامریکہ میں مقبول ہوا اور اس کے کثیر التعداد ایڈیشن پاکستان، سعودی عرب اور بیرونی ممالک سے شائع ہوئے۔ اسی طرح مسٹر مارماڈیوک پکتھال (جو عرصہ تک حیدرآباد میں رہے) M. M. Pick Thaul کے ترجمہ قرآن کی زبان کی سلاست اور اسلوب کی دلنشینی کا اہلِ علم کو اعتراف ہے اور اس ترجمۂ قرآن مجید نے بھی بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔

اس سلسلہ میں جب کہ قرآن کے انگریزی ترجمہ کا ذکر آگیا ہے، بڑی ناانصافی ہوگی اگر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم کے ترجمۂ قرآن کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس ترجمہ کی اصل قدر وقیمت اس کے وہ فاضلانہ نوٹ ہیں جو مولانا کے وسیع وعمیق مطالعہ مذاہب وتاریخ مذاہب پر وسیع نظر یہودی وعیسائی ماخذ سے پورے استفادے پر مبنی ہیں۔ اور ان سے قرآن مجید کے بیانات اور اس کے علوم وحقائق کی صداقت اور اعجاز قرآن کے ثابت کرنے کا کام لیا گیا ہے، اور جس میں مولانا اس عہد کے مترجمین قرآن مجید میں منفرد نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس محنت کی ابھی تک پورے طور سے قدر نہیں کی گئی اور اس ترجمہ کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق ہے۔

اس طبقہ کے بعد انگریزی میں اسلامیات پر کام کرنے والوں میں جس کا کام اور نام سب سے زیادہ روشن ہے۔ وہ ہمارے با اصول دوست ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی مقیم حال پیرس ہیں، ان کی دو کتابیں خاص طور پر یہاں قابلِ ذکر ہیں ایک انٹروڈکشن آف اسلام (Introduction of Islam) دوسرے محمد الرسول اللہ، (Mohammadun Rasool ullah) جن کے ذریعہ ہزاروں مسلمانوں کو جن کی واقفیت کا ذریعہ صرف انگریزی زبان ہے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھنے کا موقع ملا۔ لیکن ان کی بحث وتحقیق اور دماغی کاوش اور دیدہ ریزی کا اصل مظہر ان کی کتاب "صحیفہ ہمام ابن منبہ" (Sahifa Humam Ibn Munabbih) ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ حدیث کی جمع وترتیب وتدوین کا کام عہدِ نبوی ہی سے شروع ہوگیا تھا، اور مسلسل طریقہ پر اصحاب صحاح وسنن تک جاری رہا اور اس میں کوئی مختصر سے مختصر وقفہ اور خلا پایا نہیں جاتا اس کتاب کو لکھ کر انہوں نے نہ صرف حدیث بلکہ اسلام کی اس وقیع علمی خدمات انجام دی ہے جس کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے اس صوبہ کے ایک جواں سال فاضل ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جنہوں نے اس دعویٰ کا دستاویزی ثبوت فراہم کیا اور اپنی فاضلانہ کتاب Studies in Early Hadith Literature لکھ کر ڈاکٹر حمید اللہ کے کام کو آگے بڑھایا اور اس کو زیادہ مدلل ومفصل طریقہ پر ثابت کیا۔

اے۔ ایم۔ اے شوشتری کی کتاب Out lines of Islamic Culture اور ڈاکٹر برہان احمد

فاروقی کی The Mujaddid's Conception of Tauheed اسلامیات پر انگریزی لٹریچر میں
ایک وقیع اضافہ ہے، انگریزی میں اسلامیات پر کام کرنے والوں میں حیدرآباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف مرحوم،
(جو قرآن کے مترجم بھی ہیں) ڈاکٹر میر ولی الدین، حافظ غلام سرور، خالد لطیف گابا، ڈاکٹر سید مقبول احمد الحاج
مولانا فضل الکریم، سید اطہر حسین صاحب اور سید محی الدین صاحب کا نام تعریف و اعتراف کے ساتھ لیا جاسکتا
ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اس پوری صدی کے طویل رقبہ کو پُر و آراستہ کرنے کے لئے ناکافی ہے جو ۱۸۷۵ء
سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۷۵ء پر ختم ہوتا ہے۔

قوتِ تسخیر کا مظاہرہ حیرت کی بات بھی ہے اور اسلام کی قوتِ تسخیر اور اسکی علمی فتوحات کی دلیل بھی
کہ اس نصف صدی کے اندر سب سے زیادہ طاقتور، پُر از اعتماد بلکہ اعتماد آفریں اور ایمان پرور دو کتابیں لکھی گئیں
اور وہ دونوں ایک نومسلم کے قلم سے ہیں۔ میری مراد محمد اسد صاحب سابق (LEOPOLD WEISS) سے ہے۔
جو جرمن نژاد اور یہودی النسل نومسلم فاضل ہیں اور جنہوں نے اپنی پہلی کتاب "ISLAM AT THE CROSS ROAD"
لکھ کر اس تختی برِّ اعظم میں نہ صرف ایک ذہنی حرکت بلکہ اعتماد و یقین کی ایک نئی کیفیت پیدا کر دی۔ اسلامی شریعت
اسلامی تہذیب اور حدیث و سنّت کی طرف سے عرصہ سے ایسی پُر زور وکالت نہیں کی گئی تھی جیسی اس کتاب
میں نظر آتی ہے نیز مغربی تہذیب و اسلامی تہذیب کے بنیادی اختلاف اور مغربی تہذیب پر ایسی عالمانہ و پُر زور
تنقید کسی مغربی فاضل کے قلم سے نہیں ملے گی۔ ہم کو خوشی اور فخر ہے کہ یہ کتاب ان کے ہندوستان کے زمانۂ قیام میں
لکھی گئی۔ عربی میں اس کا ترجمہ "الاسلام علی مفترق الطرق" کے نام سے ہوا اور اس نے عرب نوجوانوں میں بھی ایک
نئی قوتِ ایمانی پیدا کر دی ان کی دوسری کامیاب تصنیف "Road To Macca" ہے جو یورپ و امریکہ میں بڑی
دلچسپی اور شوق سے پڑھی گئی۔ انہوں نے بڑی سبکدستی بلکہ چابکدستی کے ساتھ اسلامی حقائق۔ اس کی تہذیب کی برتری
اور اس کے دین کی آفاقیت و انسانیت کو ذہن نشین کیا ہے، جزیرۃ العرب، اسلامی ملکوں کے معاشرہ کی صحیح تصویر
اپنے دلچسپ صحرائی سفر کے تجربات اور مہم جوئی (ADVENTURES) کے ضمن میں اور اچھی ادبی انگریزی زبان
کے غلاف میں لپیٹ کر اہلِ مغرب بالخصوص امریکن سوسائٹی کے افراد کے کام و دہن سے اتارنے کی کوشش کی۔
اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں "الطریق الی مکۃ" اور مصنف کی اجازت
سے اردو میں "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ہندی میں جب آتما جاگی जब आत्मा जागी
کے نام سے اس کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق اور ہم مسلمانوں کے لئے عبرت انگیز اور سبق آموز حقیقت ہے کہ اسلام کی طاقتور
اور صحیح وکالت اور مغربی تہذیب پر جراتمندانہ تنقید کا کام خدا نے پھر ایک نومسلم اور اس مرتبہ نومسلم امریکن خاتون

مسز مریم جمیلہ سابق MARGARET MARCUS سے لیا۔ ان کی تمام تحریریں اور فاضلانہ مضامین ان کے عمیق مطالعہ اسلام کی صحیح ترجمانی اور تہذیب مغرب کے طلسم سے دماغ کی مکمل آزادی بلکہ بغاوت کے شاہد ہیں، ان کی دو کتابیں ISLAM AND MODERNISM اور ISLAM VERSUS THE WEST خاص طور پر بہت خیال آفروز اور بصیرت افزا ہیں۔

اس موقع پر میں قصداً اسلامیات کے اس وسیع و وقیع ذخیرہ کے مصنّفین کا نام نہیں لیتا جو اصلاً اردو یا عربی میں لکھی گئی تھیں۔ پھر ان کو انگریزی میں منتقل کیا گیا۔ ان کی فہرست طویل ہے اور آپ ان سے واقف ہیں۔ اس سلسلہ میں سیّد قطب، محمد قطب، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ان انگریزی مطبوعات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو یورپ و امریکہ اور انگریزی بولنے والے ممالک میں مقبول ہیں۔

حضرات! اب مجھے تھوڑی سی جرأت کی اور اجازت دیجئے کہ میں یہ کہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انگریزی اور عربی دونوں اجنبی و بیگانہ زبانیں تھیں، جو وہ صرف اپنے مطالعہ اور مشق کے ذریعہ حاصل کر سکتے تھے۔ اور ان میں تصنیف و تالیف کا کام دشوار بھی تھا اور نازک بھی، لیکن اس لحاظ سے ان دونوں زبانوں میں بڑا فرق ہے۔ کہ انگریزی زبان کے حاصل کرنے اور اس میں اظہار خیال کی قابلیت و قدرت پیدا کرنے کے بہترین ذرائع ہندوستان میں پائے جاتے تھے۔ اس کے سکھانے والے ابتدا میں اہل زبان اور بعد میں ان کے باکمال اور ماہر تعلیم شاگرد تھے۔ اخبارات و رسائل اور جدید مطبوعات کا بھی ایک سیلاب تھا جو انگلستان اور خود ہندوستان سے امڈتا رہتا تھا۔ پھر اس میں کمال پیدا کرنے اور اہل زبان کی طرح مشق بہم پہنچانے کے قوی محرکات و دواعی بھی موجود تھے۔ اس محنت کا صلہ بھی ملتا تھا۔ اور اس کامیابی پر شہرت و نیک نامی بھی حاصل ہوتی تھی۔

اس کے برخلاف عربی زبان ان تمام ذرائع و ترغیبات سے محروم تھی جو انگریزی زبان کو حاصل تھیں۔ یہاں اہل زبان کو دیکھنے کو آنکھیں اور ان کی باتیں سننے کو کان ترستے تھے۔ آمد و رفت کے (سوائے حج کے جو ایک عبادت اور دینی سفر ہے) وسائل و تقریبات بھی ہندوستان کے آزاد ہونے تک مفقود تھیں۔ تصنیف کے بعد طباعت و اشاعت کا یقین جو ایک مصنّف کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً مفقود تھا۔ عربی میں تصنیف کرنے والوں کو نہ حکومت کی سرپرستی حاصل تھی نہ اداروں کا تعاون، نہ پڑھنے والوں کی ہمت افزائی خود ہی لکھنا خود ہی پڑھنا، خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کا مضمون ایسی حالت میں اگر عربی میں ایک بھی اعلیٰ معیار کا تحقیقی و تصنیفی کام نہ ہوتا اور کوئی عالم کسی اسلامی یا علمی موضوع پر جگر کاوی و دیدہ ریزی سے کام نہ لیتا تو قطعاً محل تعجب نہ تھا۔ بلکہ ہر طرح قرین قیاس اور توقع کے عین مطابق تھا۔

عربی میں تحقیق و تصنیف لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں اس ایک صدی میں جسکو ہم اسلامی تقویم کے اعتبار سے ۱۳۰۱ھ سے شروع کرکے ۱۳۹۸ھ پر ختم کر سکتے ہیں۔ عربی زبان میں اتنا بڑا تحقیقی اور تصنیفی کام ہوا جو نہ صرف اپنی کیفیت اور جوہر (QUALITY) کے لحاظ سے بلکہ اپنی کمیت اور حجم (QUANTITY) کے لحاظ سے بھی موجب حیرت ہے اور جس پر ہندوستانی مسلمانوں کو اور اگر آپ اجازت دیں تو ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم کو بھی فخر کرنے کا حق ہے۔ میں اس سلسلہ میں صرف چار کتابوں کا نام لوں گا۔ ایک مولانا محمود حسن خان ٹونکی (م ۱۳۶۶) کی کتاب "معجم المصنفین" کا جو مصنفین اسلام کے سلسلہ میں ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہے۔ ساٹھ جلدوں اور بیس ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب میں چالیس ہزار مصنفین کے حالات درج ہیں۔ کتاب کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مصنف نے دو ہزار ایسے مصنفین جمع کئے ہیں، جن کے نام احمد ہیں، اس کتاب میں ڈیڑھ ہزار کتابوں کا عطر آگیا ہے، اسلامی تاریخ کے ابتدائی عہد تصنیف و تالیف سے ۱۳۵۰ھ تک ان تمام اشخاص کا تذکرہ موجود ہے جنہوں نے عربی زبان میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کے صرف چار حصے مرحوم حکومت حیدرآباد کے مصارف پر بیروت میں چھپے تھے۔ بقیہ جلدیں غالباً کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ میں اس مؤقر مجلس میں اس لئے اس کا ذکر کر رہا ہوں کہ شاید کسی اور ادارہ، تنظیم یا حکومت کو اس علمی خزانے کو محفوظ اور عام کرنے کی طرف توجہ ہو جائے۔

اس کے بعد میں ان تین کتابوں کا ذکر کروں گا جو اسی ادارہ کے بانیوں میں سے ایک عالم کی تصنیف ہیں۔ اور میرے لئے ان کے تذکرہ میں یقیناً یہ حقیقت مانع نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ میرے والد ماجد تھے کہ علم و تاریخ میں اس شرم و لحاظ کی ضرورت نہیں۔ میری مراد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی ان تین کتابوں سے ہے جن کا تعلق ہندوستان کی سرزمین اور مسلمانوں کے دور قیادت و ترقی سے ہے ان میں سے پہلی کتاب "نزہۃ الخواطر" آٹھ جلدوں اور ساڑھے چار ہزار سے زائد آدمیوں کے حالات BIOGRAPHY پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کی دوسری فنی اور تصنیفی خصوصیات سے بحث نہیں کہ ان پر تفصیل کے ساتھ کتاب کے مقدمہ اور "حیات عبدالحی" کے صفحات پر گفتگو کی جا چکی ہے، البتہ ایک خصوصیت کا ضرور ذکر کروں گا کہ اس کتاب کی بدولت ہندوستان کو تمام اسلامی ممالک میں یہ فخر کرنے کا حق حاصل ہے کہ صرف اسی کے اعیان و مشاہیر کی تاریخ و تذکرہ مسلسل و مکمل طور پر موجود ہے، اور وہ جغرافیائی حدود، زمانی اختلافات اور طبقاتی و مسلکی تنوعات سے بے نیاز ہو کر ہر اس شخص کا تذکرہ پیش کرتا ہے، جس نے کچھ امتیاز پیدا کیا اور کوئی یادگار چھوڑی، ترکی، مصر و شام حتی کہ ایران کی مردم خیز سرزمین بھی کوئی ایسا تذکرہ نہیں پیش کرسکتی جو اسکی ہزار سالہ بلکہ سیزدہ صد سالہ تاریخ پر حاوی ہو۔ یہ کام ایک اکیڈمی کا تھا جو ایک آدمی نے انجام دیا۔

تنہا یہی کتاب مصنف کو اپنے ملک اور علمی دنیا کے سامنے سرخرو کرنے کے لئے کافی تھی لیکن انہوں نے

دو کتابیں عربی میں اور لکھیں ان میں سے ایک جنۃ المشرق و مطلع النور المشرق" ہے جو عہد اسلامی کے ہندوستان کا آئینہ اور خطط کی ان کتابوں میں ایک وقیع اضافہ ہے ، جس کا بہترین نمونہ مقریزی کے " خطط مصر" اور لسان الدین الخطیب کی " الاحاطہ فی اخبار غرناطہ " ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی اردو میں " ہندوستان اسلامی عہد میں " اور انگریزی میں — INDIA IN MUSLIM RULE — کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی تیسری کتاب جو ان دونوں سے کم اہم اور محنت طلب نہیں تھی ۔ " معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف " ہے جو گویا ہندوستان کے اسلامی عہد کی علمی و تصنیفی ڈائرکٹری ہے ۔ اس میں نصاب درس کی عہد بعہد تبدیلیوں ، اضافوں اور ترامیم کا پورا نقشہ اور ہر علم و فن پر علمائے ہند کی چھوٹی بڑی تصانیف کا مرقع ہے ، گویا وہ ہندوستان کے لئے " کشف الظنون " کا درجہ رکھتی ہے ۔ اس کتاب کو ، ۱۹۵۷ء میں دمشق کی شہرۂ آفاق علمی اکیڈمی " المجمع العلمی العربی " نے " الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند " کے نام سے بڑی آب و تاب سے شائع کیا اور یہ عالم عربی اور مغربی دنیا میں بڑے قدر کے ہاتھوں سے لی گئی ۔ اس کا ترجمہ اردو میں دار المصنفین نے " ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون " کے نام سے شائع کیا اور اس کی سخت ضرورت ہے ۔ کہ انگریزی اور فرینچ میں بھی اسکو منتقل کیا جائے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ۔

عربی زبان میں ٹھوس تحقیقی کام کرنے والوں کی زریں فہرست میں علامہ عبدالعزیز میمن (سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا نام بھی شامل کرنا ضروری ہے ۔ انہوں نے لاہور و علی گڑھ میں بیٹھ کر عربی زبان و ادب کی تحقیق اور اس کے اشعار و الفاظ کی تصحیح و تنقیح اور لغت و نحو اور شعر و ادب کی قدیم کتابوں کو تحقیق سے شائع کرنے اور ان کو اپنی تحقیقات و افادات سے مزین کرنے نیز مختلف قدیم قلمی نسخوں سے اس کا مقابلہ کرنے کا وہ عظیم الشان کام انجام دیا جسکی نظیر بلاد عربیہ میں بھی مشکل سے ملے گی ، مشرق وسطیٰ کی مختلف اکیڈمیوں کو کارکن بنا کر اور لسان العرب کی تصحیح کی مؤقر کمیٹی میں شامل کر کے ادبائے عرب نے ان کی وسیع النظری اور دقیقہ رسی کا اعتراف کیا " ابو العلاء وما الیہ اور سمط اللالی " ان کی محنت دعرقریزی اور عربی زبان پر عبور کی شاہد ہے ۔ میرے ایک سوال پر حال میں انہوں نے بتایا کہ ان کو پون لاکھ سے ایک لاکھ تک عربی کے اشعار یاد ہوں گے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے ۔ کہ کسی زبان ، ادب و علم میں کمال و امتیاز پیدا کرنے اور داد تحقیق دینے کے لئے اپنا ذاتی علمی شغف کافی ہے ۔ اور علم سفر بھی ہے ، منزل بھی ، ست بھی ہے اور اس کا انعام بھی ۔

یہاں پر میں نے طوالت کے ڈر سے علماء ہند کی ان علمی اور تصنیفی خدمات کا ذکر نہیں کیا ۔ جو انہوں نے حدیث کے متون کی شرح اور ائمہ حدیث کی قدیم کتابوں کی تصحیح و تحقیق کے سلسلے میں انجام دی ہیں ۔ اس سلسلے میں بطور مثال شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی شرح موطأ جو چھ ضخیم جلدوں میں ہے ، اور " اوجز المسالک " کے نام سے مشہور ہے ۔ مولانا عبدالرحمان صاحب مبارک پوری کی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی اور مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی

کی اس محنت و دیدہ وری کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جس کا انہوں نے مصنف ابن عبدالرزاق کی طباعت اور تصحیح و تحقیق میں ثبوت دیا۔

نظامِ تعلیم کا مسئلہ | یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا قدیم نظامِ تعلیم جسکی اساس اخلاص، زہد و جفاکشی اور اخروی ثواب کی طلب پر تھی، صحیح علمی ذوق پیدا کرنے، محنت و جانفشانی کا جذبہ ابھارنے اور خاموشی و گمنامی کے ساتھ علم و تحقیق کا کام کرنے کا شوق پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب تھا؟ اور کیا اس میں اس کو بھی دخل ہے کہ شمع علم کے یہ پروانے عہدوں، بڑی تنخواہوں، ترقی حاصل کرنے اور کیریر (CAREER) بنانے سے بے نیاز ہوکر اپنا کام انجام دیتے تھے اور اداروں اور درسگاہوں کی سیاست سے کنارہ کش ہوکر پوری یکسوئی کے ساتھ علم و تحقیق کے کام میں مصروف رہتے تھے؟

حضرات! میں اس موقع پر ان جدید عربی تصانیف کا ذکر نہیں کروں گا، جو علمائے ہند اور فضلائے ندوہ کے کے قلم سے نکلی ہیں اور مشرق وسطیٰ اور ممالکِ عربیہ میں ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، نہ ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو اسلامیات پر اردو میں لکھی گئی ہیں، پھر ان کا عربی میں ترجمہ ہوا کہ ان کی فہرست طویل ہے اور میں نے اپنے اس خطبہ کے لئے انگریزی زبان میں اسلامیات کے اس کام کو موضوع بحث بنایا ہے جو اس تختی برّاعظم میں انجام پایا۔ اس طویل سمع خراشی کے بعد آخر میں یہ عرض کروں گا۔ کہ اسلامی ممالک کی فکری قیادت تو بڑی چیز ہے۔ ان کو ذہنی انتشار بلکہ ذہنی ارتداد سے بچانے کے لئے اسکی سخت ضرورت ہے کہ ہماری علمی و ذہنی توانائیوں کا بڑا حصہ انگریزی میں اسلامی لٹریچر پیدا کرنے پر صرف ہو، جو اب بھی دل و دماغ کو متاثر کرنے اور علمی حقائق کو ذہن میں بٹھانے اور اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کے بارے میں احساس کمتری اور خود فراموشی بلکہ خودکشی سے بچانے کے لئے جادو کا اثر رکھتی ہے اور ابھی ان ملکوں میں اس کا سحر نہیں ٹوٹا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی مؤقر کانفرنس جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کسی ایک اہم علمی مرکز یا دانش گاہ میں منعقد ہوتی ہے۔ میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ گذشتہ نسل کے تحقیقی کام کرنے والوں کی طرف سے پیہم یہ صدا آرہی ہے ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

آخر میں آپ کی اس عزت افزائی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ اس مؤقر مجلس کی صدارت کے لئے مجھ طالب علم کا انتخاب کیا اور یہاں اپنی کانفرنس منعقد کرکے اس ادارہ اور اس شہر کو عزت و مسرت بخشی، جو عرصہ تک علم و تعلیم کا بڑا مرکز رہا ہے اور جس کا مرتب کیا ہوا نصاب ہندوستان اور بیرون ہند میں سکہ رائج الوقت کی طرح رواں رہا ہے۔ اور یہیں سے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اصلاح نصاب اور جدید مطالعہ و فکر کی دعوت دی ہے۔ خدا کرے یہ کانفرنس ہر طرح اپنے مقاصد میں کامیاب اور نئے عزائم اور مساعی کا مقدمہ ثابت ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ ■■

جناب اختر راہی - ایم۔ اے

مولانا محمد عبد الشکور فاروقی لکھنوی رح

امام اہل سنت مولانا محمد عبد الشکور فاروقی ماضی قریب کے ایک بلند پایہ عالم دین، صاحب نظر مؤرخ، بے مثال مناظر اور کامیاب مبلغ تھے۔ اُن کی علمی و فکری اور تعلیمی و تبلیغی خدمات کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ ان کی جامع سوانح عمری لکھی جاتی لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علم و ادب کے وسیع ذخیرہ میں اُن کے بارے میں چند تعزیتی تحریروں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

موصوف کی تحریری بد شعور میں پڑھنے کا اتفاق ہُوا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے تفقہ اور علم و نظر کا اثر گہرا ہوتا چلا گیا۔ ایک عرصہ سے ان کے رسالہ "النجم" کی تلاش میں ہوں جس کے حصول میں تاحال کامیابی نہیں ہوئی۔ چند جستہ جستہ شمارے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن سے مولانا مرحوم کی سیرت و سوانح اور علم و فکر پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

ابتدائی زندگی: مولانا محمد عبد الشکور فاروقی بن ناظر علی بن فضل علی۔ یو۔ پی (بھارت) کے مردم خیز قصبہ کاکوری میں ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ / ۱۰ جنوری ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی حافظ ناظر علی صوفی منش بزرگ تھے اور مولوی حافظ عبد السلام ہسوی (م ۱۲۹۹ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ ضیاء الحسن علوی کی روایت کے مطابق "حافظ ناظر علی کی باطنیت اور مراتب کی ادنیٰ تفصیل یہ ہے کہ حضرت سیدنا شاہ ابو الخیر دہلوی کو کہتے سنا ہے کہ ارے میاں! انہوں نے حضرت جبریل کی بھی زیارت کی ہے" [۲]

مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم اور فارسی درسیات کی تحصیل مولوی عبد الوہاب ہسوی اور مولوی منظر حسین کو رٹا جہاں آبادی سے کی۔ اس کے بعد "نور الانوار" تک درس نظامی کی کتابیں ہسوہ میں مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ فتح پور میں اُن کے والد تحصیلدار تھے وہاں کے دوران قیام میں مولانا نور محمد فتح پوری سے استفادہ کیا [۳]

آخر میں مولانا عین القضاۃ لکھنوی[۴] (م ۲ رجب ۱۳۴۲ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ زمانۂ تعلیم کی یادیں خود مولانا فاروقی نے ان الفاظ میں تازہ کی ہیں:-

"یہ فقیر ۱۳۰۹ھ میں واردِ لکھنؤ ہوا۔ اُس وقت حضرت (مولانا عین القضاۃ) مرحوم نے پڑھانے کا سلسلہ بہت کم بلکہ قریب قریب ختم کر دیا تھا۔ اور فرماتے تھے کہ دماغ بھی بہت ضعیف ہوگیا ہے اور طلبہ کی حالت دیکھ کر نہ مطالعہ میں محنت کرتے ہیں، نہ سمجھنے اور یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پڑھانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ اس جواب نے مایوس تو بہت کیا مگر میں نے حاضری کا سلسلہ قائم رکھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد فرمایا کہ ایک صاحب نے علم الفرائض شروع کی ہے۔ اگر آپ کا جی چاہے تو شریک ہو جائیے۔ چنانچہ میں نے اس میں شرکت کی۔ دوسرے ہی دن جب آپ نے دیکھا کہ وہ صاحب جو اصل کتاب پڑھنے والے تھے۔ سبق یاد کرنے میں مجھ سے پیچھے رہ گئے، تو میری طرف نظرِ عنایت مبذول ہوتی چلی گئی یوماً فیوماً بڑھتی گئی۔ حسب ذیل کتب جناب مرحوم سے میں نے پڑھیں۔

علم الفرائض، اقلیدس، میبذی، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملّا جلال، میر زاہد شرح مواقف، تحقیقات مرضیہ، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، مسلم الثبوت، خیالی مع حاشیہ سیالکوٹی، شرح چغمینی، بست باب اصطرلاب، شرح نخبۃ الفکر، مشکوٰۃ، بخاری، ترمذی۔ سوا ترمذی اور شمس بازغہ کے سب کتب میں اوّل سے آخر تک میری ہی قرأت تھی۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جو طالب علم عبارت غلط پڑھتے تھے۔ صرف و نحو میں ان کی استعداد اچھی نہ ہوتی تھی۔ اُن کو قرأت کی اجازت نہ دیتے تھے .... میں اس زمانہ میں محلہ رانی کٹرہ میں مقیم تھا ...... ۱۳۱۷ھ میں کتبِ درسیہ میری ختم ہوئیں[۵]۔"

تدریس | مولانا محمد عبدالشکور فاروقی نے دورانِ طالب علمی میں تدریس شروع کر دی تھی۔ خود اونچی کتابیں پڑھتے اور مبتدیوں کو ابتدائی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ جس زمانہ میں مولانا عین القضاۃ سے پڑھ رہے تھے انہوں نے کچھ طلبہ کے اسباق اُن کے حوالے کئے ہوئے تھے۔ فارغ التحصیل ہوئے تو کچھ عرصہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مولانا ندوہ سے پندرہ روپے ماہانہ پاتے تھے[۶] پھر دہلی چلے گئے اور میرزا حیرت دہلوی (م ۴ مئی ۱۹۲۸ء/ ۱۴ ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ) کے ساتھ بحیثیت مترجم و مصنف کام کیا۔ دہلی سے واپس لکھنؤ آئے اور مولانا عین القضاۃ کے بنا کردہ مدرسہ فرقانیہ میں تدریس شروع کی اور ۱۳۳۴ھ تک فرائضِ تدریس ادا کئے۔ مولانا کچھ عرصہ مدرسہ اسلامیہ محلّہ امروہہ میں بھی مدرس رہے تھے۔

طبابت | مولانا فنِ طب کے فاضل تھے۔ اس فن میں انہوں نے حکیم عبدالولی سے استفادہ کیا تھا شروع میں کچھ عرصہ مطب کرتے رہے تھے۔ لیکن بعد میں اس سے کنارہ کش ہو کر خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے۔

بیعت | مولانا مرحوم سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا شاہ ابواحمد مجددی بھوپالیؒ (م ۱۸ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ) سے بیعت تھے۔ داخلِ بیعت ہونے کا واقعہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

"اس خاکسار کے داخلِ سلسلہ ہونے کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے۔ ایک غیبی سامان پیش آیا کہ میں بہ زاجہا حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی بڑے ہی لطف وکرم سے فرمایا کہ آپ کے آنے کے لئے میں دعائیں مانگا کرتا تھا اور غایت لطف وکرم کے ساتھ یہ شعر زبانِ مبارک سے ادا فرمایا ؎

وصل کی مانی ہیں کیا کیا منتیں ! چھلّے درگاہوں میں بندھواتے ہیں ہم

شب کو بعد نمازِ عشاء اپنے پاس اس گناہ گار کا بستر بھی بچھوایا اور اس وقت اس ناچیز کو سنا کر مگر دوسروں سے مخاطب ہو کر کئی بار یہ شعر پڑھا ؎

ہم نہ ہوں گے تو پھر پچھتایئے گا مفت تیرے ہاتھ سے جاتے ہیں ہم

اس ناچیز نے سمجھ لیا کہ مقصود میں ہوں۔ زہے قسمت مگر پھر بھی بمقتضائے احتیاط نمازِ استخارہ پڑھی۔ دل کو حضرت ممدوح کیطرف مائل پاکر نمازِ فجر سے پہلے عرض کیا کہ حضرت مجھے بھی داخلِ طریقہ کر لیجئے اور دلربا تبسم کے ساتھ فرمایا کہ بہت اچھا! نمازِ فجر پڑھ لیجئے۔"[۳۹]

چنانچہ داخلِ طریقۂ نقشبندیہ ہوئے۔

پنجاب کا تبلیغی سفر | مولانا مرحوم نے رنگوں سے پنجاب تک بیسیوں تبلیغی سفر کئے اور ان کا ہر تبلیغی سفر اپنے نتائج کے اعتبار سے کامیاب ثابت ہوا۔ شوال ۱۳۴۵ھ / مئی ۱۹۲۷ء میں وہ انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ جلسہ میں ان کی دو تقریریں ہوئیں۔ موضوع حضرات شیخینؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ کے باہمی تعلقات تھا۔

مولانا مرحوم کی آمد کی اطلاع دور دور تک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ قادیان سے چند افراد انہیں اپنے شہر لے جانے کے لئے حاضر ہوئے۔ مولانا نے قادیان کا سفر کیا اور مرزا آنجہانی کے مولد میں خانہ ساز نبوّت کے بخیئے ادھیڑے۔ اُن کی تقریر سے متاثر ہو کر چھ افراد نے قادیانیت سے توبہ کی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ قادیان سے واپس بھیرہ اور سیال شریف آئے۔ مولانا کے تمام سفروں کا احاطہ مفصّل سوانح حیات

ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

دار المبلغین لکھنؤ مولانا خود تو تبلیغی کام کر رہے تھے اور ان کے چند ساتھی بھی سرگرمِ کار تھے۔ تاہم تبلیغی مقاصد کے لئے علماء کو خصوصی تربیت دینے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ۱۳۵۱ھ میں مولانا مرحوم نے "دار المبلغین" کے نام سے لکھنؤ میں ایک ادارہ قائم کیا۔ جہاں علمائے دین کو فرقِ باطلہ کا لٹریچر بطورِ خاص پڑھایا جاتا اور فرقِ باطلہ کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ دار المبلغین سے سینکڑوں مبلغ تیار ہوئے جنہوں نے میدانِ عمل باطل فتنوں کی سرکوبی کی۔

قید و بند مولانا مرحوم کو اپنے مشن کی خاطر جیل بھی جانا پڑا۔ ۱۹۴۰ء کی تحریک مدح صحابہؓ میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ جیل بھیج دئے گئے۔ اسی قید کے زمانہ میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا تھا۔

وفات مولانا مرحوم تقریباً اٹھاسی سال عمر پا کر ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ / ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء کو مغرب سے کچھ پہلے لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ ان کی رحلت پر دینی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ دینی رسائل نے تعزیتی شذرات لکھے۔ ذیل میں ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) کا شذرہ درج کیا جاتا ہے۔

> "ہمارے پرانے نامور علماء ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن کی آخری یادگار مولانا عبد الشکور صاحب نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔ مولانا کی ذات جامع کمالات اور اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ تھی۔ علم و عمل اور دین و تقویٰ میں اُن کا درجہ بہت بلند تھا۔ تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و تبلیغ، ارشاد و ہدایت ہر راہ میں ان کے نمایاں کارنامے ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک ان کا فیض جاری رہا۔ اور ان کے ذریعہ بہتوں کو ہدایت حاصل ہوئی۔ ایک زمانہ میں پورے ہندوستان میں اُن کے کارناموں کی شہرت تھی مگر ادھر پچیس تیس سال سے انہوں نے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور موتوا قبل ان تموتوا کی عملی تفسیر بن گئے تھے۔ اب ایسے علمائے ربانی کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول اور ان کے مدارج کو بلند فرمائے[۹]"

علمی رسوخ مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" (جنہیں مولانا مرحوم کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہے) اپنے تاثرات میں مولانا مرحوم کے علمی رسوخ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> "ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہلِ سنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے۔ اور اس کام کے لئے یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخِ علمی کی ضرورت نہیں رہی اس لئے جن لوگوں

کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا۔ ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ ممدوح صرف مناظر و مصنّف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے۔ نامور اصحابِ درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں۔ سلامتی فہم کے ساتھ ذہانت و ذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصّہ وافر عطا کیا تھا۔ ان سب چیزوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا۔"

تصانیف مولانا محمد عبدالشکور نے تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ بھرپور علمی کام کیا ان کے متعدد مناظرے چھپے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل تالیفات ان کے رشحاتِ قلم میں سے ہیں:۔

۱۔ ترجمہ و تفسیر قرآن ۱۔ ترجمہ قرآن مجید ۲۔ تفسیر آیاتِ مختلفہ، آیت تطہیر، آیت طالوت، آیت اولوالامر، آیتِ مباہلہ، آیتِ استخلاف اور آیتِ استخلاف فی الارض وغیرہ، ۲۲ متفرق آیات کی تفسیر ہے۔ تفسیر آیات ان کے تدبّر فی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

سیرت و تاریخ ۳۔ تحفۂ عنبریہ (مختصر سیرتِ نبویہ) ۴۔ ترجمۂ شمائل نبوی ۵۔ سیرت خلفائے راشدین۔ ۶۔ ترجمہ تاریخ طبری (حصّہ اوّل) ۷۔ ترجمہ اُسد الغابہ فی معرفت الصحابہؓ (دس جلدیں) ۸۔ ترجمہ ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) تا آخر مقصد اوّل۔ ۹۔ غزوات النبی۔

فقہ ۱۰۔ علم الفقہ (۷ جلدیں) ۱۱۔ وصاف ترجمہ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

تردید رفض و بدعت ۱۲۔ ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ (شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی)

۱۳ النصرت الغیبیہ علی الفرقۃ الشیعیہ۔ ۱۴۔ مناظر (۱۹۲۶ء) ۱۵۔ قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی۔

۱۶۔ تکملہ تنبیہ الحائرین موسوم بہ تفضیح الجائرین ۱۷۔ حضرت علیؓ کی مقدس تعلیمات۔

متفرقات ۱۸۔ تدبیر و تقدیر ۱۹۔ اسلام۔ میرا مذہب، موسوم بہ تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام۔

النجم مولانا مرحوم نے ۱۳۲۳ھ میں یہ دینی مجلّہ جاری کیا تھا۔ اس کے مقاصد میں سرفہرست رفض و بدعت کا محاکمہ تھا۔ معاصر دینی صحافت میں "النجم" اپنی مثال آپ تھا۔ اخبارات اور رسائل نے اس کے بارے میں پُر زور تبصرے لکھے اور اہلِ سنّت کو اسکی سرپرستی پہ آمادہ کیا۔

دارالعلوم دیوبند کے آرگن "القاسم" نے مدیر "النجم" کی خدمات کا ذکر کرنے کے بعد "النجم" کے بارے

میں لکھا تھا :

"ہم افرادِ قوم سے بہ زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مجلہ کی توسیعِ اشاعت میں ہر ممکن سعی سے دریغ نہ فرمائیں"[11]

معارف (اعظم گڑھ) نے لکھا : "یہ مذہبی رسالہ ۔۔۔ اپنے رنگ میں لاجواب ہے"[12]

مولانا عبدالحلیم شرر مدیر "دلگداز" نے بھی اپنے قارئین کو "النجم" کی سرپرستی کے لئے آمادہ کیا اور اسے ایک اچھا رسالہ قرار دیا۔ "النجم" ابتداء میں ہفت روزہ تھا بعد میں پندرہ روزہ ہو گیا، مالی وسائل کی کمی کے باعث بند بھی ہوتا رہا تاہم ایک عرصہ دینی خدمات انجام دے کر روشنی پھیلاتا رہا۔ "النجم" کے صفحات پر سینکڑوں بلند پایہ مضامین پھیلے ہوئے ہیں۔ کاش! ہمارے اشاعتی ادارے ان کی ترتیب و تدوین کراتے اور انہیں اہلِ ذوق تک پہنچاتے۔

حواشی

[1] سید عبدالسلام حسینی واسطی بن مولانا سید ابوالقاسم ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے انہوں نے ابتدائی درسیات کی تحصیل مولانا سید سراج الدین سے کی پھر لکھنؤ میں مولانا معین الدین کڑوی، ملا معین فرزند ملا مبین لکھنوی اور دوسرے علماء سے اکتسابِ فیض کیا۔ حدیث و تفسیر کا درس شاہ عبدالغنی مجددی سے لیا اور شاہ ابوسعید مجددی سے بیعت ہوئے، ان ہی سے اجازتِ بیعت حاصل تھی۔ ۴ر شوال ۱۲۹۹ھ/ ۲۰ر اگست ۱۸۸۲ء کو وفات پائی۔ (ملخص از حیات عبدالحئی ص ۳۹۔ ۴۱) [2] ہفت روزہ چٹان۔ لاہور۔ شمارہ ۱۹ر فروری ۱۹۶۲ء، مضمون "یادِ ایام"۔ [3] نزہت الخواطر ج ۸، ص ۲۵۳ [4] مولانا سید محمد عین القضاۃ بن سید محمد وزیر حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے، کم سنی میں والد ماجد کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور یہیں قیام پذیر ہو گئے۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے شاگرد تھے اور بلند پایہ عالمِ دین اور مدرس تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت موسیٰ جی ترکیسری سے بیعت تھے۔ ۳ر رجب ۱۳۴۳ھ کو وفات پائی۔ [5] النجم لکھنؤ۔ جلد ۲ شمارہ ۱۱ ص ۳۔۴ [6] چٹان۔ لاہور۔ حوالہ سابق۔ [7] ابواحمد بن خطیب احمد بن شاہ رؤف احمد مجددی۔ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالغنی مجددی سے مدینہ منورہ میں بیعت ہوئے۔ اتباعِ سنت کا بہت خیال رکھتے تھے اور اپنا زیادہ وقت ریاضت و عبادت میں صرف کرتے تھے۔ ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ کو وفات پائی۔ شاہ محمد یعقوب مجددی اُن کے خلف الصدق تھے۔ [8] النجم لکھنؤ جلد ۲، شمارہ ۷ [9] ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) جلد ۹۸، شمارہ ۵ [10] ماہنامہ الفرقان۔ لکھنؤ۔ جلد ۲۹ شمارہ ۱۱ ص ۴۲۔۴۴ [11] ماہنامہ القاسم۔ دیوبند۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ بحوالہ النجم جلد ۴، شمارہ ۱۷ [12] النجم۔ لکھنؤ۔ جلد ۴، شمارہ ۱۷۔

قسط ۳

مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ کی لطائف قدوسی کی تاریخی اہمیت

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب
لاہور

حضرت گنگوہی میدان جنگ میں جب بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان پانی پت میں جنگ ہوئی تو اردگرد کے علاقے سے لوگ بھاگ گئے اور تمام علاقہ ویران ہو گیا۔ ان دنوں کہیں بھی امن نہ تھا۔ حضرت گنگوہی اپنے اہل وعیال کو لے کر کتانہ چلے گئے۔ یہ مقام ابراہیم کے لشکر کے عقب میں دریا کے پار واقع تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جو بلا آئے گی وہ ابراہیم اور اس کے لشکر پر نازل ہوگی۔ اور انہیں کسی محفوظ مقام تک جانے کا وقت مل جائے گا۔

افغان سپاہی حضرت گنگوہی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ وہ گروہ در گروہ ان کی زیارت کو آنے لگے۔ ابراہیم کو معلوم ہوا تو اس نے حضرت گنگوہی کو اپنے لشکر میں لانے کی کوشش کی۔ ان دنوں حضرت کہا کرتے تھے کہ اس بار انہیں خیریت معلوم نہیں ہوتی اور وہ ابراہیم کے لشکر کو پانی پت سے آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ جب ابراہیم نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت گنگوہی نے اپنے اہل وعیال (بشمول شیخ رکن الدین) کو "ہندوستان" کی طرف بھیج دیا۔ اور خود اپنے بڑے فرزند شیخ حمیدالدین اور خادم خاص سید راجا کو ساتھ لے کر افغان لشکر میں چلے آئے۔

ایک روز حضرت گنگوہی نے شیخ حمیدالدین سے فرمایا کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ قید ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی قید و بند کو اپنے بزرگوں کی سنت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ لہٰذا انہیں اختیار ہے کہ وہ اگر کسی محفوظ مقام کی طرف جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ اور سید راجا نے عرض کیا کہ جو طریقہ حضرت نے اختیار کیا ہے وہی انہوں نے بھی اختیار کیا ہے۔ وہ انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو حضرت گنگوہیؒ نے شیخ حمیدالدین سے فرمایا کہ انہیں اپنے گھوڑے کی حرکات دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو شکست ہوگی۔ اس لئے اب وہاں سے چلنا چاہئے۔ ابھی ایک پہر دن بھی نہیں گزرا تھا کہ ابراہیم کی شکست کا شور بلند ہوا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں مغل سواروں نے انہیں گھیر لیا۔ حضرت گنگوہی کا گھوڑا اور کپڑے مغلوں نے چھین لئے۔ شیخ حمیدالدین اور سید راجا گرفتار ہوئے۔ مغلوں نے حضرت گنگوہی کی دستار

---

۹۲ ایضاً ص ۷۲ ۹۳ ایضاً ص ۶۳-۶۴

شیخ حمیدالدین کے گلے میں ڈال کر انہیں فتراک سے باندھ لیا۔ حضرت نے ان کو تسلی کے لئے فرمایا کہ پیروں کی دستار ان کے گلے میں ہے۔ یہی شفاعت کے لئے کافی ہوگی۔ مغلوں نے انہیں دوسرے اسیروں کے ساتھ دہلی کی طرف ہانکہ شروع کیا۔ حضرت گنگوہی کی عمر اس وقت ۳۰ برس تھی اور ان میں چلنے کی ہمت نہ تھی اس کے باوجود موصوف پانی پت سے پا پیادہ دہلی پہنچے[۹۳]

افغانوں کا شمالی ہند سے انخلاء | سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کی خبر ملتے ہی افغانوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ شمالی ہند سے بہار اور بنگال کی طرف بھاگنے لگے۔ دریائے سرو (سرجو) کے گھاٹ پر بھگوڑے افغانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ کشتیاں کم پڑ گئیں۔ دتو سروانی عیسیٰ خاں سروانی کے ساتھ گھاٹ پر موجود تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ مغل عنقریب ہی وہاں پہنچنے والے ہیں۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی افغانوں کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے۔ اس وقت افغانوں کی بے قراری کا عالم دیدنی تھا۔[۹۴]

شمالی ہند سے فرار کے بعد سروانیوں نے بہار میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان ابراہیم لودھی کا بھائی سلطان محمود بھی بہار پہنچ گیا۔ افغان اسے اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اور کچھ نہیں تو انہیں "بادشاہ" تو مل گیا ہے۔ سلطان محمود نے افغانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کیا اور وہ بنارس تک پیش قدمی کر آیا۔ اس جمعیت کے باوجود افغانوں پر مغلوں کا خوف چھایا ہوا تھا۔

دتو سروانی بھی اتفاق سے سروانیوں کے اس لشکر میں موجود تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں حضرت گنگوہی کی زیارت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ افغانوں کی جمعیت اگرچہ زیادہ ہے لیکن وہ شامتِ نفس میں گرفتار ہیں۔ اس لئے بابر ضرور کامیاب ہوگا۔ اگلی صبح جب دتو، عیسیٰ خان سروانی سے ملنے گیا تو وہاں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ عیسیٰ خاں نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے رات کا خواب بیان کیا۔ عیسیٰ خاں نے کہا کہ اس کا بھی یہی خیال ہے۔ دتو کی روایت ہے کہ تیسری رات کو سلطان محمود کیمپ سے بھاگ گیا اور اس کے ساتھ ہی افغانوں کی جمعیت بھی منتشر ہو گئی۔ اس موقعہ پر کچھ افغان بالا پتھ چلے گئے جہاں راجہ بیر سنگھ نے انہیں گزارے کے لئے زمینیں دے دیں[۹۵]

مغلوں کا ظلم و ستم | بابر کے برصغیر پر حملے سے قبل حضرت گنگوہی کی اہلیہ نے خواب دیکھا کہ خراسان کی طرف سے آگ بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اگلی صبح انہوں نے اپنے بیٹوں سے ذکر کیا۔ کہ جلد ہی کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔ اس واقعہ کے جلد بعد بابر نے برصغیر پر حملہ کیا۔ بابر کی پیش قدمی کی خبر سنتے ہی شہری اور دیہاتی محفوظ مقامات کی طرف بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی اپنے متعلقین کے ساتھ شاہ آباد سے گنگوہ چلے گئے۔ مغلوں نے شاہ آباد اور دیپالپور (من مضافات شاہ آباد)

---

۹۳ ایضاً۔ ص ۶۳، ۶۴ ۹۴ ایضاً ص ۶۲، ۹۵ ایضاً۔ ص ۴۳، ۴۴،

تباہ کردئے - دیپالپور علماء وصلحاء کی بستی تھی - بابر کی تاخت کے وقت " علماء وصلحاء بسیار کشتہ شدہ کتاب خانہا غارت شدند" شیخ رکن الدین کے الفاظ میں " دارالاسلام " غارت ہوگیا۔[96] اس غارت گری کے موقعہ پہ حضرت گنگوہی کے مرشدزادے شیخ عبدالشکور نے ان سے التماس کی :

شما توجہ بدرگاہ حق تعالیٰ بکنید کہ علماء وصلحاء مقتول مے شود و دارالاسلام غارت می شود[97]	آپ خدا تعالیٰ سے رجوع فرمائیں کہ علماء وصلحاء قتل کئے جارہے ہیں اور دارالاسلام غارت ہوا جاتا ہے ۔

حضرت گنگوہی نے توجہ فرمائی اور شیخ عبدالشکور کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ۔

نکبات بانبیاء رسیدہ تو بیچارہ کیستی[98]	انبیائے کرام کو بھی تکالیف پہنچی ہیں تم کون ہوتے ہو ؟

شاہ آباد کی تباہی | بابر نے اپنی تزک میں برصغیر پر تسلط جمانے کے واقعات کچھ اس انداز سے لکھے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں - ہمارے خیال میں بابر نے لکھتے وقت رحم دلی اور انسان دوستی کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا - اس کے جانشینوں کے درباروں میں لکھی جانے والی تاریخوں میں بھی اس قسم کے ظلم وستم کا کوئی ذکر نہیں - حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے ۔

شیخ رکن الدین نے بابر کے سپاہیوں کے ہاتھوں شاہ آباد کی تباہی کا منظر پیش کیا ہے - موصوف لکھتے ہیں کہ یہ سرسبز و شاداب قصبہ اس طرح سے برباد ہوا کہ اب وہاں ویرانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔[99] حضرت گنگوہی کی ایک تحریر سے بھی مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے - موصوف ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں ۔

مغلاں تاختند وچندیں ہزار خون ریختند - وچند ہزار ولی مومن را زیر تیغ آوردند[100]	مغلوں نے حملہ کرکے ہزاروں کا خون بہا دیا - انہوں نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا ۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو اطاعت قبول کرنے اور خدا پر ایمان لانے کا پیغام بھیجا تو ملکہ نے اپنے سرداروں کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا - سرداروں نے اسے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا یقین دلایا - ملکہ نے انہیں مخاطب کرکے کہا :-

---

[96] ایضاً - ص ۶۳ [97] ایضاً [98] ایضاً [99] ایضاً ص ۳۳

[100] عبدالقدوس گنگوہی ، مکتوبات قدوسیہ مکتبہ احمدی دہلی مکتوب نمبر ۱۱۰ ص ۲۰۵ ، ۲۰۶

اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً ۚ وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

تحقیق بادشاہ جس وقت داخل ہوتے ہیں کسی شہر میں خراب کرتے ہیں اس کو اور کرتے ہیں عزت والوں کو ذلیل، اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔

جب ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے معصوم عن الخطا پیغمبر سے ایسے "ظلم" کی توقع رکھتی تھی تو بابر جیسے بادشاہ سے جس کی رگوں میں چنگیز۔ اور تیمور کا خون موجزن تھا اس سے بھی بڑھ کر ظلم و تشدد کی توقع رکھنی چاہیئے۔ برصغیر پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیئے اس نے اور اس کے ماتحتوں نے مقامی آبادی پر بلاتفریق مسلم و غیر مسلم جو ظلم روا رکھا۔ اس کی صدائے بازگشت لطائف قدوسی کے صفحات سے سنائی دیتی ہے۔ شیخ رکن الدین نے پکڑ دھکڑ اور حبس بے جا کے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔

برصغیر پر قبضہ کے بعد مغلوں نے مقامی آبادی پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے بڑے بڑے سفاک اور ظالم امرا کو انتظامی عہدوں پر مامور کیا تھا۔ شیخ رکن الدین اس پر شاہد ہیں کہ گنگوہ کے مغل عالم میر حسن علی نے ظلم و ستم پر کمر باندھی۔ مقامی "فقرا و ضعفا" کو بڑا رنج ہوا۔ حضرت گنگوہی نے حاکم وقت کی منت و سماجت کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ جہاں ظلم ہو گا وہاں نہیں رہیں گے۔ موصوف نے سواری طلب کی اور "بجہتہ مقہوری ظالمان" بلند آواز سے

اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر

پڑھتے ہوئے گنگوہ سے چل دیئے۔ حضرت گنگوہی کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور چند روز بعد میر حسن علی مرگیا[۱۰۲]

بابر اور اس کے ماتحتوں کے ظلم و ستم کے باوجود حضرت گنگوہی نے اس کے ساتھ روابط قائم کر لیئے۔ مکتوبات قدوسیہ میں بابر کے نام ان کا ایک خط موجود ہے جس میں موصوف اسے ۔۔۔ امام زمان امام جہان سلطان وقت جوان بخت خدا پرست جہاندار شہریار دیندار ضعیف پرور عدل گستر آسمان جاہ فلک سپاہ سلطان الاعظم المعظم ابوالمجاہد المظفر حضرت ظل اللہ فی الارض۔ کے القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ حضرت اسے زمین پر خدا کا سایہ اور اولو الامر مانتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوب مرغوب میں بابر کو نماز باجماعت ادا کرنے، علم اور علما کو دوست رکھنے اور شہروں میں محتسب مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے اسے یہ بھی لکھا کہ وہ صرف دیانت دار لوگوں کو اہم عہدوں پر فائز

۱۰۱۔ قرآن مجید، سورہ النمل آیت ۳۴

۱۰۲۔ شیخ رکن الدین، لطائف قدوسی۔ ص ۶۸

کرے اور کسی کافر کو عہدۂ دیوانی پر مامور نہ کرے۔ حضرت گنگوہی سرکاری دفتروں میں غیر مسلموں کو محسوبی قسم کے کام کرتے بھی دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ انہوں نے بابر کو کافروں سے جزیہ وصول کرنے کا بھی مشورہ دیا۔ خط کے آخر میں حضرت گنگوہی بابر سے کہتے ہیں کہ اس عہد میں خیر القرون جیسی رونق دیکھنے میں آنی چاہئے۔[۱۰۳]

بابر نے حضرت گنگوہی کے خط کا کیا جواب دیا۔ اس کا کوئی ریکارڈ ہمارے پاس موجود نہیں۔ تاہم یہ ثابت ہے کہ بابر ایک بار ان سے ملنے گیا اور ان کے حلقے میں بیٹھا رہا۔[۱۰۴]

ہمایوں سے تعلقات ہمایوں کی تخت نشینی سے قبل ہی حضرت گنگوہی نے ہمایوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے اور اس کے ساتھ خط وکتابت شروع کر دی تھی۔ محمد ہمایوں مرزا کے نام ایک خط میں حضرت گنگوہی اسے لکھتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ اوصاف حمیدہ سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ علم اور جمال سے بھی آراستہ ہے انہوں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ تمام امور میں علماء و صلحاء سے مشورہ لیتا اور عارفوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ نیز وہ ارباب علم و معرفت کا قدردان ہے۔ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔[۱۰۵]

ہمایوں کی تخت نشینی کے بعد حضرت گنگوہی نے اسے ایک خط لکھا۔ جس میں موصوف نے اُسے عالم پناہ۔ امام زمان۔ امام جہان۔ حافظ بلاد اللہ و ناصر عباد اللہ۔ حضرت ظل اللہ کے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں کہ اس کے عہد میں ائمہ اور فقراء امن وامان سے رہتے ہیں اسے چاہئے کہ روز بروز اسلام کی رونق بڑھانے میں کوشاں رہے۔[۱۰۶]

ہمارے خیال میں یہ خط ہمایوں کے ابتدائی عہد حکومت میں لکھا گیا تھا۔ کیونکہ چند ہی سال بعد حضرت گنگوہی نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ اور وہ اسے برصغیر سے نکالنے پر تل گئے تھے۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے۔

ہمایوں اور بہادر شاہ گجراتی سلطان بہادر شاہ گجراتی نے راجستھان کی سب سے طاقتور ریاست میواڑ کی راجدھانی چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے کافی طول پکڑا اور محصورین بھوکوں مرنے لگے۔ راجپوتوں نے ہمایوں کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ ان کی مدد کو آئے تو وہ اسے فی منزل ایک لاکھ ٹنکے ادا کریں گے۔ ہمایوں کی دارالحکومت

---

[۱۰۳] شیخ عبدالقدوس، مکتوبات قدوسیہ۔ مکتوب نمبر ۱۶۹۔ ص ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷

[۱۰۴] ابوالفضل۔ آئین اکبری۔ مطبوعہ دہلی ۱۲۷۲ھ۔ ج ۲۔ ص ۲۱۴

[۱۰۵] شیخ عبدالقدوس، مکتوبات قدوسیہ۔ مکتوب نمبر ۱۷۰ ص ۳۳۷، ۳۳۸

[۱۰۶] ایضاً۔ مکتوب نمبر ۱۷۱۔ ص ۳۳۸، ۳۳۹

سے روانگی سے قبل ہی بہادر شاہ نے چتوڑ فتح کر لیا اور بہت سے کافروں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اسی اثنا میں بہادر شاہ کو اطلاع ملی کہ ہمایوں سارنگ پور پہنچ گیا ہے اور اس کے خلاف پیش قدمی کرنے والا ہے۔ بہادر شاہ نے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی اور چتوڑ کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بقیہ لشکر کے ساتھ ہمایوں کے مقابلہ کو بڑھا۔ بہادر شاہ نے قلعہ مرہ دسور (منڈسور) کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ ہمایوں نے اس کی رسد کاٹ دی جس کے نتیجے میں اناج کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں اور اس کے لشکری گھوڑے ذبح کر کے کھانے پر مجبور ہو گئے۔

دتو سروانی بہادر شاہ کیمپ میں موجود تھا۔ اس نے خواب میں حضرت گنگوہی کی زیارت کی انہوں نے اس سے کہا کہ دیکھو ہمایوں کے خیمے کی طنابیں کہاں تک ہیں؟ اس نے دیکھا تو مانڈو اور گجرات تک پہنچی ہوئی تھیں۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ اس معرکے میں ہمایوں کامیاب ہوگا۔ دتو بیدار ہوا تو اسے جان کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اسی روز سورج غروب ہوتے ہی بہادر شاہ نے راہ فرار اختیار کی۔ اُس کے لشکر سے یوں غائب ہوتے ہی سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دتو بھی بھاگ نکلا۔ اور اندھیرے میں بھٹک گیا۔ رات کو اس نے دوبارہ حضرت گنگوہی اور شیخ حمیدالدین کو خواب میں دیکھا انہوں نے کہا کہ وہ اس کی مدد کو آئے ہیں اور خدا نے چاہا تو وہ محفوظ رہے گا۔ اگلی صبح دتو کو راستہ مل گیا اور وہ برہان پور پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں اس نے منڈسور سے بھاگے ہوئے افغانوں کی بہت بڑی تعداد کو موجود پایا۔[۵۵]

دتو سروانی نے ہمایوں کے خلاف شیر شاہ اور بہادر شاہ کی جنگوں میں حصہ لیا وہ ان جنگوں کا عینی شاہد ہے۔ یہیں اس حیرت ہے کہ ہمایوں اور شیر شاہ کے سوانح نگاروں نے لطائف قدوسی جیسے اہم ماخذ کو کیسے نظر انداز کر دیا ہے۔

سلطان بہادر شاہ کا قتل: سلطان علاءالدین ابن سلطان سکندر لودھی جانپانیر آیا تو اسے خبر ملی کہ سلطان بہادر شاہ کنبھایت پہنچ گیا ہے۔ علاءالدین نے دتو سروانی کے ہاتھ اسے چار ہاتھی۔ سات اونٹ اور سات سو شتر فیاں بطور تحفہ بھیجیں۔ دتو ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ فرنگی (پرتگیز) جہازوں میں آتشیں اسلحہ لئے دیو (ڈیو) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور وہ دیو پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ سلطان بہادر شاہ دیو کو بچانے کے لئے کنبھایت سے نکلا۔ اسی اثنا میں علاءالدین بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ دتو کا کہنا ہے کہ انہی دنوں اس نے خواب میں حضرت گنگوہی کو دیکھا۔ موصوف نے اس سے کہا کہ گجرات چھوڑ دے وہاں بڑا خلل پیدا ہونے والا ہے۔ اتفاق سے ٹھٹھہ سے آنے والے ایک مسافر کے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی اور اس کی معیت میں دتو چانپانیر ہوتا ہوا مانڈو پہنچ گیا۔ پندرہ روز بعد سے اطلاع ملی کہ فرنگیوں نے بحری جنگ میں سلطان بہادر شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ سلطان کے قتل کے بعد گجرات میں

---

۵۵ رکن الدین، لطائف قدوسی ص ۷۵، ۷۶

"مغل عظیم" پیدا ہوگیا۔[۸]

ہمایوں گجرات میں

ہمایوں کے احمد آباد پر قبضہ کے بعد سلطان بہادر شاہ نے دیو میں پناہ لی۔ جب اس سانحہ کی خبر برہان پور پہنچی تو سلطان سکندر لودھی کا فرزند علاء الدین اپنے سپاہیوں کو لے کر بہادر شاہ کی مدد کو نکلا۔ اتفاق سے دتو سروانی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ جب وہ نندربار پہنچا تو اس نے خواب میں حضرت گنگوہی کو دیکھا۔ موصوف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "اے دتو! آگے بڑھو اور ہمارا پیغام گجرات کے پیروں کو پہنچا دو۔ اے دتو! تم گجرات جاؤ اور وہاں کے تمام پیروں کو ہمارا سلام پہنچاؤ اور ان سے کہو کہ ہمایوں بادشاہ اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے اور وہ کفر و اسلام میں تمیز نہیں کرتا۔ ہم اسلام کی مدد اور تمہاری اعانت کے لئے آئے ہیں۔ اگر آپ کا ارادہ ہو تو ہم آئیں۔ ہم اور آپ مل کر ہمایوں کو گجرات سے نکال دیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہم مانڈو جا کر ہمایوں کو وہاں سے بھگا دیں اور آپ اسے گجرات سے نکال دیں تاکہ اسلام کو امن اور قرار ملے۔"

دتو سروانی نے عرض کی کہ گجرات کے پیر اس مقام سے بہت دور ہیں۔ وہ وہاں سے کیسے پہنچے اور کس طرح ان کا پیغام ان تک پہنچائے۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ وہ بآسانی وہاں پہنچ جائے گا۔ دتو خواب ہی میں گجرات پہنچ گیا۔ احمد آباد میں حضرت قطب عالم کی خانقاہ میں گجرات کے تمام پیر موجود تھے۔ وہ ان کو حضرت گنگوہی کا پیغام پہنچانے کے بارے میں فکر مند تھا کہ اتنے میں ایک شخص آگے بڑھا اور اس سے پوچھا کہ دتو بھلا اسی کا نام ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ شاہ منجھن اسے بلاتے ہیں۔ جب وہ ان کے سامنے پہنچا تو انہوں نے پوچھا کہ شیخ عبدالقدوس نے کیا فرمایا ہے؟ دتو نے ان کا پیغام پہنچایا اور وہاں سے فارغ ہو کر شیخ احمد کھٹوؒ کی خانقاہ میں پہنچا۔ وہاں بھی پیروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ شیخ احمد کھٹو نے دتو سے کہا کہ شیخ عبدالقدوس کو ان کا سلام پہنچا دیں اور ان سے کہیں کہ وہ سب مل کر ہمایوں کو گجرات اور مانڈو سے نکالیں گے تاکہ گجرات میں پھر سے اسلام کا غلبہ ہو۔

شیخ رکن الدین رقم طراز ہیں کہ دتو سروانی نے اگلی صبح اپنے ساتھیوں سے اس خواب کا ذکر کیا تو ان کے ایک ساتھی روپ چند نے علاؤالدین سے کہا کہ ہمایوں اب گجرات میں نہیں ٹھہر سکتا۔ اس واقعہ کے پندرہ روز بعد اطلاع ملی کہ بہادر شاہ نے دیو سے سرکھیج (جہاں حضرت شیخ احمد کھٹوؒ کا مزار ہے) آ کر ہمایوں کو شکست دی اور اس لڑائی میں بہت سے مغل مارے گئے۔ ہمایوں گجرات سے بھاگ کر آگرہ پہنچ گیا۔[۹]

یہ واقعہ اگرچہ خواب کا ہے لیکن اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہمایوں کو گجرات سے نکالنے میں مذہبی حلقوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مذہبی حلقوں میں ہمایوں کے خلاف نفرت موجود تھی اور یہی چیز اس کی ناکامی کا ایک اہم سبب بنی۔

۸۔ ایضاً ص ۸۰۔۸۱ ۹۔ ایضاً ص ۷۹۔۸۰

جن دنوں بہادر شاہ راجستھان میں ہندوؤں کے سب سے بڑے مرکز چتوڑ کا محاصرہ کئے پڑا تھا تو برصغیر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ اس موقعہ پر راجپوتوں نے ہمایوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور اسے فی منزل ایک لاکھ ٹنکے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ہمایوں نے نقم کی لالچ میں بہادر شاہ کی مملکت پر چڑھائی کر دی۔ مسلمانوں کو عموماً اور مذہبی حلقوں کو خصوصاً اس بات سے بڑا رنج پہنچا کہ ہمایوں نے سلطان بہادر شاہ کی مدد کرنے کی بجائے اس موقعہ پر کافروں کا ساتھ دیا۔ اور سلطان بہادر شاہ کی مملکت پر حملہ کر کے اس کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔ مذہبی حلقوں نے ہمایوں کے اس جرم کو معاف نہیں کیا۔ اور وہ اس کو برصغیر سے نکالنے پر کمربستہ ہو گئے۔ ہمایوں کی ناکامی کے اسباب میں مذہبی حلقوں کی ناراضگی آج تک سربستہ راز بنی رہی ہے۔ شیخ رکن الدین نے اس راز سے پردہ اٹھا کر ہمیں صحیح طور پر صورت حال کو سمجھنے میں مدد دی ہے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے مکتوبات میں ایک بڑا اہم خط موجود ہے جو انہوں نے اپنے ایک مرید عبدالرحمن کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر تاریخ تو موجود نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط ایسے ہی حالات میں لکھا گیا تھا۔ جن میں ہمایوں کی حرکات کی وجہ سے اسلام کے مفاد کو برصغیر میں نقصان پہنچ رہا تھا۔ حضرت گنگوہی، عبدالرحمن کو لکھتے ہیں:

امروز آفتاب اسلام قریب بغروب است۔ [۱۱]	آج اسلام کا سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔

برصغیر کے مشائخ کا افغانوں کی طرف رجحان شیخ رکن الدین، دتو سروانی سے روایت کرتے ہیں کہ ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ایک لڑائی میں دونوں لشکروں کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا۔ ہمایوں کا لشکر قصبہ بھوجپور کی سمت تھا اور شیر شاہ کا لشکر اس کے بالمقابل دریا کے اس پار۔ ایک روز ہمایوں نے اپنے لشکر میں اعلان کیا:

اگر دریں بار فتح ماشود و ہزیمت افغانان شود، نام افغانان زندہ نگذارم اگرچہ طفل باشد۔	اگر اس بار ہماری فتح ہوا اور افغانوں کو شکست تو میں افغانوں کا نام تک باقی نہیں رہنے دوں گا خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

چند روز بعد ہمایوں کشتیوں کے پل کے ذریعے دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے شیر شاہ کے کیمپ کے مقابل اپنا کیمپ لگایا۔ دتو سروانی بڑا متفکر تھا کہ خدا معلوم کیا ہو۔ ایک شب اس نے حضرت گنگوہی کو خواب میں دیکھا۔ موصوف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اپنا خیمہ دیکھو"۔ جب اس نے نظر اٹھائی تو اپنے خیمے کی طنابیں

---

[۱۱] شیخ عبدالقدوس۔ مکتوبات قدوسیہ بمکتوب نمبر ۱۱۰۔ ص ۲۰۵

ہمایوں کے لشکر میں دیکھیں۔ ہمایوں کا خیمہ گرا پڑا تھا اور مغل منتشر ہو رہے تھے۔ ہمایوں انہیں دلاسا دے رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے اکیلا نہ چھوڑیں۔ اس کے لشکری اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمایوں اس صورتِ حال پر بڑا متاسف تھا۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ بادشاہوں کا حال دیکھ لو۔ اس کے بعد موصوف نے دتو کی دلجوئی کے لئے فرمایا :-

فتح شیر شاہ ست وہزیمت ہمایوں	شیر شاہ کو فتح اور ہمایوں کو شکست
بادشاہ ست و مدد پیران طرف شیر شاہ	ہو گی۔ پیر شیر شاہ کی مدد کر رہے ہیں۔
است	

جب دتو بیدار ہوا تو اس کی تشویش جاتی رہی۔ اس واقعہ کے چوتھے روز ہمایوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر کے مشائخ اور مذہبی حلقے مغلوں کی بجائے افغانوں کے طرف دار تھے۔

ٹینڈر نوٹس

محکمہ پولیس صوبہ سرحد درج ذیل کپڑے کی سپلائی کیلئے سپلائرز / تیار کنندہ سے ٹینڈر بمعہ نمونہ مطلوب ہیں۔ جو کہ زیر دستخطی کے دفتر میں ۱۵ تک پہنچنے چاہئیں۔ ٹینڈر کسی ایک آئیٹم یا تمام آئیٹم کے لئے ہو، کوئی ٹینڈر بھی مطلوبہ تاریخ کے بعد قابل قبول نہ ہو گا۔

۱۔ ڈوبل کیولری کلاتھ آف گرے کلر۔ عرض ۵۷ "

۲۔ گبارڈین کلاتھ آف لائٹ اولیو کلر۔ عرض ۱۵۰ سنٹی میٹر ۶۵ % کاٹن ۳۵ % پولسٹر۔

۳۔ سیلولر کلاتھ آف لائٹ اولیو کلر۔ عرض ۱۰۸ سنٹی میٹر ۶۵ % کاٹن ۳۵ % پولسٹر۔

زیر دستخطی کسی ایک یا تمام ٹینڈر کو منسوخ کرنے یا تاریخ بدلنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹ ٹینڈر کے ساتھ پیش کرنے ضروری ہیں۔

(اے) مالی سرٹیفکیٹ جو کہ کسی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سے اٹیسٹڈ کیا ہو۔

(بی) انکم ٹیکس سرٹیفکیٹ جو کہ انکم ٹیکس محکمہ کا عطا کیا ہوا ہو۔

(سی) زر ضمانت مالیتی -/۵۰۰۰ روپے کی رسید جو کہ حبیب بنک پولیس روڈ پشاور میں انسپکٹر جنرل آف پولیس صوبہ سرحد کے نام جمع کیا گیا ہو۔ زرِ ضمانت ٹینڈر منظور نہ ہونے کی صورت میں قابل واپسی ہو گا۔

نثار احمد چوہدری

ڈی۔ آئی۔ جی / ہیڈ کوارٹرز

برائے انسپکٹر جنرل آف پولیس صوبہ سرحد پشاور

INF (P) 2164

جناب محمود عارف صاحب
دانش گاہِ پنجاب۔ لاہور

مدینہ منوّرہ کے مکاتب اور ان کی تعلیمی خدمات

درس گاہ ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مدینہ منوّرہ کی تعلیم گاہوں میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی علمی اور مذہبی درس گاہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ جس نے اپنی بے نظیر کارکردگی سے تاریخِ اسلام کو بے حد متاثر کیا اور علم و فنون کی بے نظیر خدمت سرانجام دی۔

مختصر حالاتِ زندگی سعد نام، ابو سعید کنیت، خدرہ خاندان، والد کا نام مالک بن سنان بن عبید اور والدہ کا نام انیسہ بنت حارثہ (از قبیلۂ عدی بن نجّار) ہے۔ ہجرت نبویہ سے ۱۲ برس قبل پیدا ہوئے[1] ماں باپ دونوں نے اوائل میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے ان کی پرورش خالص اسلامی ماحول میں ہوئی۔ غزوۂ بنی مصطلق اور ان کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ اسلامی حکومت کے عروج و زوال کی کئی داستانیں ان کے سامنے بنیں۔ وہ قافلۂ صحابہ کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے ۷۳ھ تک دینی، تعلیمی اور ملکی سطح پر اپنی وسعت کے مطابق خدمت کرتے رہے۔ ۷۴ھ میں بعمر ۸۶ سال بمقام مدینہ منوّرہ انتقال فرمایا اور انصار کے شہر خموشاں میں مدفون ہوئے[2]

دورِ تعلیم و تربیت حضرت ابو سعید خدریؓ نے اپنے بچپن اور شباب کی آنکھیں، اسلام کے دامن میں کھولی تھیں۔ بچپن میں اسلام کی محبت (بموجب صَادَفَ قلبًا

خالیاً فتمکنا) ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ شباب نے اس محبت کی آگ کو دو آتشہ بنادیا چنانچہ ابوسعید ایک سرگرم مجاہد ، سرفروش غازی کی حیثیت سے اسلام کی تبلیغ و تعلیم اور توسیع و اشاعت میں مصروف رہے ۔

علم کے حصول کا زمانہ تقریباً دس برس پر محیط ہے ۔ ذاتِ نبویہ کے علاوہ مسجد نبویہ میں کئی حلقہ ہائے درس قائم تھے ۔ قرآن مجید ایک قاری سے پڑھا ۔ فقہ اور احکام مسائل کی تعلیم کے لیے خاص مسجد نبوی میں کئی جلیل القدر انصاری صحابہؓ نے اپنے حلقہ ہائے تعلیم قائم کر رکھے تھے ۔ یہ حضرت ابوسعید کی طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا ۔ لوگوں کے پاس تن ڈھانکنے کو کپڑے تک میسر نہ تھے ۔ ایک دوسرے کی آڑ میں چھپ چھپ کر بیٹھتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ۔ اس وقت قاری قرات کر رہا تھا ۔ آپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا ۔ اس تمام جماعت میں صرف ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے [۳]

حدیث ، فقہ اور احکام و مسائل مدرسۂ نبویہ سے حاصل کئے ، ذات نبویہ کے علاوہ خلفائے اربعہ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے تلمذ کا شرف بھی حاصل کیا ۔[۱]

صحابہ کرامؓ کی یہ خصوصیت ، بلاتخصیص سب میں پائی جاتی ہے کہ اُنہوں نے حصول علم میں کبھی کوئی رکاوٹ محسوس نہ کی ۔ اُنہیں علم کے حصول کا جذبہ کسی حالت میں چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا ۔ حضرت ابوسعید خدریؓ بھی اس وصف میں دُوسرے صحابہ کے ساتھ برابر کے شریک ہیں ۔

علم و فضل

حضرت ابوسعید خدریؓ کا شمار ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی عمر عزیز کے گراں مایہ لمحات اسلام کی خدمت اور اس کی توسیع و اشاعت کے لیے کوششوں میں صرف کر دیئے ۔ وہ اپنے دور کے عظیم فقیہ اور فقہ و حدیث کے بہت بڑے ماہر تھے ۔[۲]

ان سے جلیل القدر صحابہ سے لے کر ادنیٰ تابعین تک سبھی نے استفادہ کیا ۔ ان کے باب فضائل کا زرّیں پہلو یہ ہے کہ اُن سے ابن عمر ، ابن عباس ، زید ابن ثابت جیسے صحابہ نے بھی ، جو بجائے خود علم کا سمندر تھے استفادہ کیا ۔ ان سے کل مرویات کی تعداد ۱۱۷۰ ہے ۔[۳]

قارئین کتب حدیث کے لیے ابوسعید خدری کا نام کسی تعارف یا تعریف کا محتاج نہیں ہے ۔ زندگی کے بہت سے اہم مسائل ان سے منقول ہیں ۔ حدیث کی کوئی کتاب ہو ابوسعید خدری اس میں ضرور ملیں گے ۔ ان کی محدثانہ بصیرت ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگوں کے ہاں مسلم ہے ۔

درس گاہ کے کوائف

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی درسگاہ تقریباً ۷۴ھ تک قائم رہی ۔ مدینہ کی درسگاہوں میں یہ درس گاہ اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل

ہے کہ اس کا زمانہ دوسروں (مثلاً مکتب عائشہ م ۵۸ھ ، درس گاہ ابوہریرہ م ۵۹ھ) سے زیادہ طویل ہے۔ اس درس گاہ نے اس دورِ ظلمت میں بھی جو ۶۰ھ سے ۷۳ھ تک کے عرصہ پر محیط ہے شمع علم کو فروزاں رکھا اور بھٹکے ہوئے راہ نوردوں کی رہنمائی میں مصروف رہی۔

مستفیدین ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ ہم صرف چند مشہور ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔ صحابہ میں سے مندرجہ ذیل نام قابل ذکر ہیں :-

(۱) زید بن ثابتؓ (استاد بھی شاگرد بھی) (۲) عبداللہ بن عباسؓ (۳) انس بن مالکؓ (۴) عبداللہ بن عمرؓ (۵) عبداللہ بن زبیرؓ (۶) جابر بن عبداللہؓ (۷) ابو قتادہؓ (۸) محمود بن لبیدؓ (۹) ابوالطفیلؓ (۱۰) ابو امامہؓ بن سہل۔

تابعین میں سے : (۱۱) سعید بن مسیبؒ (۱۲) طارق بن شہابؒ (۱۳) عطاءؒ (۱۴) مجاہدؒ (۱۵) ابو عثمانؒ (۱۶) سہندیؒ (۱۷) عبید بن عمیرؒ (۱۸) عیاض بن ابی سرح (۱۹) بشر بن سعید (۲۰) سعید بن سیرین (۲۱) عبداللہ بن محرز (۲۲) ابوالمتوکل ناجی۔[۱]

آپ کا حلقۂ درس ہمیشہ لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ خاص سوال کرنے والوں کو بمشکل ہی موقعہ مل سکتا تھا۔ اوقات درس کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص کسی مسئلہ کی بات پوچھتا تو اسے جواب دے کر تشفی فرماتے[۲] روایت کرنے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے ساتھ ان کا سلوک ہمیشہ ہمدردی، اخوت، اور شفقت و محبت سے لبریز ہوتا۔ اگر کوئی شاگرد انہیں گھر سے بُلاتا تو بلا تکلف باہر نکل کر اس کے ساتھ چل پڑتے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مذکور ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ انہیں آواز دی وہ چادر اوڑھے گھر سے نکل آئے۔ ابوسلمہؓ نے کہا کہ ذرا باغ تک چلیں آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ چنانچہ وہ فوراً ساتھ ہو لیے۔[۳]

مدینہ منورہ کی صبح سعادت کا طلوع اس وقت ہوا تھا۔ جب آفتاب نبوت کی کرنیں اس کے درو دیوار سے ٹکرائی تھیں اور اس شہر کی خاک کا ذرّہ ذرّہ اس کے سامنے چشم براہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد سے یہ شہر دنیا سے اسلام کا معلم و مربّی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس شہر میں صحابۂ کرام کی سب سے زیادہ اکثریت رہائش پذیر تھی۔ ان میں قرّاء بھی تھے اور علما و فضلاء بھی۔ ان میں محدّث بھی تھے اور فقیہ بھی۔ رازدارانِ شریعت بھی تھے اور شہسوارانِ حکومت و سیاست بھی۔ اس طرح یہ شہر ایک ایسی یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا جس میں فنونِ اسلامیہ کے مختلف شعبہ جات کے لئے جدا جدا شعبے (DEPARTMENTS) قائم تھے۔ اور ہر شعبے میں تکمیل کی شان ظاہر اور ہویدا تھی۔

اس شہر نبوی میں کتنے مکاتب قائم تھے؟ یہ سوال ہے - جس کے چند گوشوں سے اس مقالے میں نقاب اٹھایا جائے گا۔ مختصراً یہ کہ اس شہر میں جتنی پاکیزہ اور باکمال ہستیاں آباد تھیں وہ سب اپنی اپنی جگہ ایک مکمل مکتب تھیں۔ بعض اشخاص بجائے خود ایک انجمن ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام ہستیاں مکمل مدارس اور تعلیم گاہوں کی حیثیت رکھتی تھیں گو ان کی تعلیم کے لئے کوئی جگہ، کوئی وقت مخصوص نہ تھا مگر اس کے باوجود بھی چلتے پھرتے، آتے جاتے ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان میں بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مساجد میں اپنے اپنے حلقہ ہائے درس قائم کر لئے ہوئے تھے۔ جن میں عام طور سے اس وقت درس تدریس کی مسند آراستہ ہوتی تھی جب معلم اور متعلم دونوں مشاغل ضروریہ سے فارغ ہوتے تھے یا کوئی اچانک ضرورت پیش آجاتی تھی۔ یہ بے شمار درس گاہیں مدینہ منورہ کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یا دوسرے لفظوں میں مدینہ کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی مکتب ضرور قائم تھا۔ ان تمام کا احاطہ نہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ البتہ چند ایسے مکاتب کا ذکر کیا جا رہا ہے جنہیں اسلامی تعلیم میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

دنیائے اسلام کا اولیں دار الخلافہ مدینۃ المنورہ جن گراں مایہ جواہرات علمی سے مالا مال تھا۔ دوسرے اسلامی شہر اس شرف سے بہت کم فیض یاب تھے۔ اس شہر میں قرارت کے مدارس بھی تھے اور فقہ و احکام کے مراکز بھی۔ حدیث نبوی کی تعلیم گاہیں بھی سرگرم عمل تھیں اور تفسیر قرآن کے مکاتب بھی۔ ہم شروع میں قرارت کی ان درسگاہوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مکتب زید بن ثابت انصاریؓ | مدینۃ المنورہ کی قابل ذکر اور قابل فخر درسگاہوں میں ایک یادگار مکتب حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا ہے۔

نام و نسب | نام زید، کنیت ابو سعید، ابو خارجہ، ابو عبد الرحمٰن، القاب کاتب الوحی، مقری، فرضی، خزرجی ثم نجاری ہے۔ سلسلہ نسب کچھ اس طرح ہے۔ زید بن ثابت بن ضحاک بن زید بن لوذان --- اور والدہ کا نام نوار بنت مالک بن معاویہ ہے۔ پیدائش ۱۱ ق ھ ہیں اور سعادت ایمانی ۱ ھ میں بعمر ۱۱ سال نصیب ہوئی۔ مدینہ منورہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کاتبین وحی میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ بعد از وفات نبوی بعہد ابو بکر صدیق اور پھر بعہد عثمان غنی ان کمیٹیوں کے امیر بنائے گئے جو جمع قرآن کی غرض سے انتخاب کی گئی تھیں اور اپنی ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ ۴۵ھ میں بعمر ۵۶ سال مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور انصار کے گورِ غریباں میں مدفون ہوئے۔

علم و فضل | حضرت زید بن ثابتؓ کی داستان علم و فضل کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ وہ قرون اولیٰ کے کبار صحابہ کے ممتاز فرد تھے۔ ان کا شمار راسخون فی العلم کے طبقے میں ہوتا ہے۔ ان کے دامن میں قرارت، فرائض، قضایا اور فتاویٰ وغیرہ جیسے اہم علوم شامل تھے۔ حضرت زیدؓ بالخصوص علم القرارت اور علم الفرائض میں مہارت رکھتے تھے جس کی وجہ

سے ان کو فرضی اور مقری کے القاب ملے۔ جو ان فنون میں ان کی خصوصی مہارت کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا سب سے عظیم کارنامہ ان کا اُمت کو ایک ہی قراءت اور ایک ہی مصحف پر متفق کرنا اور قرآن مجید کو ما بین الدفتین مرتب کرنا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کی بہت سی آیات حضرت زید بن ثابت کے پاس محفوظ تھیں جن کا چند صحابہ کے علاوہ کسی کو علم نہ تھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے یہ دو عظیم کارنامے ہیں جن کی بدولت ان کا نام دنیائے اسلام میں دوامی حیثیت اختیار کر گیا[۹]

تلامذہ اور مستفیدین | حضرت زیدؓ کی درسگاہ سے ایک کثیر گروہ نے استفادہ کیا۔ چند مخصوص حضرات کے اسماء یہ ہیں:-

۱۔ انس بن مالکؓ۔ ۲۔ ابو ہریرہؓ۔ ۳۔ ابو سعید خدریؓ۔ ۴۔ سہل بن حنیفؓ۔ ۵۔ ابن عمرؓ۔ ۶۔ سہل بن سعدؓ۔ ۷۔ عبداللہ بن یزید خطمیؓ۔ ۸۔ سعید بن مسیبؒ۔ ۹۔ قاسم بن محمدؒ۔ ۱۰۔ ابان بن عثمانؒ۔ ۱۱۔ خارجہ بن زیدؒ۔ ۱۲۔ سہل بن ابی حثمہؒ ۱۳۔ ابو عمرؒ۔ ۱۴۔ مروان بن حکمؒ۔ ۱۵۔ عبید بن سباقؒ۔ ۱۶۔ عطاء بن یسارؒ۔ ۱۷۔ بسر بن سعیدؒ۔ ۱۸۔ حجر مدریؒ۔ ۱۹۔ طاؤسؒ۔ ۲۰۔ عروہ۔ ۲۱۔ سلمان بن زیدؒ۔ ۲۲۔ ثابت بن عبیدؒ۔ ۲۳۔ امام سعدؒ۔[۱۰]

ان سے روایات کی تعداد نہایت قلیل یعنی ۹۲ (جن میں ۵ متفق علیہ) ہے جس کی وجہ ان کی احتیاط پسندی ہے جیسا کہ ذکر ہوا۔ ان کا اصل شرف علم فرائض اور علم القراءت میں ان کا خصوصی امتیاز ہے۔ ان ہی علوم میں ان کی درسگاہ دنیائے اسلام کے طول و عرض میں خصوصی شہرت رکھتی تھی۔ اور طالبانِ شوق دور دراز سے استفادہ کرنے کے لئے حاضر ہوتے اور اپنے دامن کو علم و عرفان کے موتیوں سے بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ حضرت زیدؓ نے عوامی ضرورت کے پیش نظر دورِ فاروقی میں علم فرائض کے متعلقہ مسائل میں ایک کتابچہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ جو غالباً اس موضوع پر دنیائے اسلام کی اولین تصنیف ہو گی۔ قرأت کے سلسلہ میں بھی ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ ان سے ان کی قرأت کو ابن عباس، ابن عبدالرحمٰن سلمی۔ ابو العالیہ ریاحی۔ ابو جعفر چار راویوں نے روایت کیا ہے۔[۱۱]

مکتب اُبی بن کعب انصاریؓ | مدینہ منورہ میں قراءت کا سب سے بڑا مدرسہ حضرت ابی بن کعب انصاریؓ کا تھا جن کی قراءت کا زمانۂ نبوی سے اتنا شہرہ ہو چکا تھا کہ بارہا زبانِ نبوی سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئی تھیں۔

نام و نسب | نام اُبی، کنیت ابو المنذر، ابو الطفیل۔ القاب۔ سید القراء، سید الانصار نجاری ہیں۔

سلسلہ نسب ابی بن کعب۔ بن قیس۔ بن عبید۔ بن زید۔ بن معاویہ اور والدہ کا اسم گرامی صہیلہ تھا۔ حضرت ابی زمانہ جاہلیت سے علم و ادب سے لگاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی دور میں تورات پڑھی اور فن کتابت سیکھا، علوم تورات کی روشنی میں انہوں نے ذاتِ نبویؐ کو پہچانا۔ اور علم کتابت سے حاملِ وحی کی وحی کو مرتب کر کے تقویت پہنچائی۔ ہجرتِ نبوی کے بعد اولین وحی کو لکھنے کا شرف حضرت ابی کو ہی میسر آیا۔[۱۲] ذاتِ نبوی کا اس درجہ قرب تھا کہ نزولِ وحی سے سب سے پہلے

انہی کو آگاہی ہوتی تھی۔ بعد از وفات نبوی ایک طویل عرصہ تک قرآن اور علوم قرآن کی خدمت کرتے رہے۔ اور مدینہ منورہ ۳۰ھ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

علم وفضل حضرت ابی ان بزرگوار ہستیوں میں سے تھے جو اپنی داستان علم وفضل کے لئے کسی تعریف یا تعارف کی احتیاج نہیں رکھتے۔ زمانۂ نبوی ہی سے ان کی ثقاہت وبزرگی کا اعتراف کیا جانے لگا تھا خود زبانِ نبوی سے "اَقْرَءُهُمْ اُبَیّ" (ان میں سب سے بڑے قاری ابیؓ ہیں۔ تمغۂ مل چکا تھا[۲] آخری سال آپؐ نے حضرت ابی کو قرآن سنا کر ان کی قرآن دانی کا اعتراف کیا۔ ان کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ انصار میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور میں نماز تراویح کی امامت کے لئے ابی بن کعبؓ ہی کا بجا انتخاب فرمایا تھا۔ اور یہ بھی اعلان کیا تھا کہ جو شخص فن قرأت سیکھنا چاہتا ہو وہ ابی بن کعبؓ کی طرف رجوع کرے[۵] ان علوم میں ان کی خصوصی توجہ کے مرکز اور الفاظ قرآن اور تعبیر معانی قرآن تھے اور یہی ان کی فضیلت اور بزرگی کے معیار اعلیٰ بنے۔

درسگاہ کے کوائف یہ بات قابل اور قابلِ فخر ہے کہ مدینہ منورہ میں اس وقت جب کہ انصار اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے حضرت ابی مسجد کے ایک گوشے میں وہ اپنی دکان سجا کر بیٹھتے تھے جس میں قرآن کریم کی بلا معاوضہ تعلیم دی جاتی اور مستفیدین مفت استفادہ کرتے تھے۔

تلامذہ ومستفیدین حضرت ابیؓ کے اس مکتب سے ایک گروہ کثیر نے استفادہ کیا۔ چند بزرگوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:- ۱۔ عمر فاروقؓ ۲۔ ابوایوب انصاریؓ ۳۔ عبادہ بن الصامتؓ ۴۔ ابوہریرہؓ ۵۔ ابوموسیٰ اشعریؓ ۶۔ انس بن مالکؓ ۷۔ عبداللہ بن عباسؓ ۸۔ سہل بن سعدؓ ۹۔ سلیمان بن صردؓ ۱۰۔ سوید بن غفلہؓ ۱۱۔ زر بن حبیش ۱۲۔ ابوالعالیۃ الریاحیؒ ۱۳۔ ابوعثمان النہدیؒ ۱۴۔ ابوادریس الخولانیؒ ۱۵۔ عبداللہ ابن الحارثؒ ۱۶۔ عبدالرحمٰن بن ابزیؒ ۱۷۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ ۱۸۔ عبید بن عمیرؒ ۱۹۔ عیسی السعدیؒ ۲۰۔ ابن الخوتکیہؒ ۲۱) سعید بن المسیبؒ[۶]

وفات نبویؐ کے بعد قرأت کی اس درسگاہ کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ خلافت راشدہ بالخصوص دور فاروقی میں انہیں سرکاری طور پر سید القراء کے منصب پر فائز کیا گیا۔

حضرت ابیؓ بے تکلف زندگی گذارتے تھے۔ اس کے اثرات مدرسہ کی زندگی میں دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کی نشست گدے پر ہوتی تھی اور شاگرد ان کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو جاتے تھے۔ درس قرآن کے لئے کوئی وقت نہ تھا جہاں اور جب بھی موقعہ ملتا اپنے اس فرض کی ادائیگی فرماتے رہتے تھے۔ ان کا خصوصی وصف قرآن اور علوم قرآن میں خصوصی درک ہے۔ ان سے مندرجہ ذیل تین راویوں کے ذریعے قرأت کے تین مستقل سلسلے منقول ہوئے ہیں۔ ۱۔ عبداللہ بن کثیر ۲۔ نافع بن عبدالرحمٰن ۳۔ ابوریم مدنی۔ معانی ومفاہیم میں ان کی روایات کے ذخیرے مصنف ابن ابی حاتم۔ تفسیر ابن جریر الطبری اور امام الرازی کی

مفاتیح الغیب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ روایات حدیث میں ان کا معیار مکثرین صحابہ کی صف میں ہوتا ہے۔ ان سے کل مرویات کی تعداد ۱۱۷۰ ہے جس میں سے متفقاً تین اور بخاری میں تین اور مسلم میں سات احادیثیں منفرداً ہیں۔[۱]

---

[۱] ان کی عمر اور تاریخ پیدائش میں کچھ اختلاف ہے۔ ہم نے علامہ ذہبی (دیکھئے تذکرہ الحفاظ، ذکر ابوسعید خدری) کی رائے کو ترجیح دی ہے کیونکہ دوسری رائے قطعاً خلاف عقل ہے۔

[۲] حوالہ مذکور، نیز سیر الصحابہ، مہاجرین ۲، ذکر ابوسعید خدری۔

[۳] مسند ۳ : ۶۲

---

[۱] سیر الصحابہ مہاجرین، ۲، ذکر ابوسعید خدری۔

[۲] اصابہ : ۳ - تذکرہ ابوسعید خدری، نیز سیر الصحابہ انصار ۱ : ص ۲۱۱

[۳] مرویات کی تعداد کے لیے ملاحظہ ہو ابن سعد ۲ ج ۲ قسم ثانی۔ نیز سید سلیمان ندوی۔ سیرت عائشہ ص ۱۸۷ - ۱۸۸۔

---

[۱] سیر الصحابہ انصار ۱ : ص ۲۱۲ - [۲] مسند ج ۳ : ص ۳۵ -

[۳] مسند ج ۳ : ص ۶۰ -

---

[۱] سعید انصاری : سیر الصحابہ، انصار ج ۱، ص ۳۸۰ تا ۳۹۸، اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل زید بن ثابت

[۲] اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل زید بن ثابت، بذیل قرآن جمع و کتابت

---

[۱] سیر الصحابہ ص ۳۹۴۔ [۲] سعید انصاری، سیر الصحابہ، انصار ص ۳۹۸ [۳] سعید انصاری کتاب مذکور ص ۱۵۰، ۱۵۱

[۴] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۲۲۔

---

[۱] شبلی نعمانی، الفاروق [۲] سیر الصحابہ ج، ص ۱۵۷ [۳] الذہبی سیر اعلام النبلاء طبع مصر ص ۲۸۰ تا ۲۸۱ نیز سیر الصحابہ ج، ص ۱۵۷۔

جناب منظر عباسی۔ ایم۔اے

مسلسل

جدید زبانوں کے عربی مآخذ

ژالہ ـــــــ ہوا میں موجود آبی بخارات ایک خاص بلندی پر پہنچ کر سردی کے باعث منجمد اور ٹھوس بن جاتے ہیں اور جب زمین کی طرف گرتے ہیں تو ہوائی تیز لہر سے ٹکراتے اور اُچھل کر واپس بلندی پر چلے جاتے ہیں جہاں پانی کے دُوسرے منجمد ذرات اُن سے چمٹ جاتے ہیں اور یوُں ان کا حجم بڑھ جاتا ہے یہ عمل بار بار وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ان ذرّات کا حجم کافی حد تک بڑھ جاتا ہے اور یہ ذرّے اس حد تک وزنی ہوجاتے ہیں کہ ہوا کی لہریں اُنہیں اچھال نہیں سکتیں تب یہ اولوں (ژالے) کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں۔

ژالہ ـــ اولہ ـــ کو انگریزی میں HAIL - جرمن۔ ڈچ اور سویڈش میں - HAGEL ڈنیش اور نارویجن میں HAGL۔ یہودی میں HOGEL- اور اسپرانتو میں HAJLO کہتے ہیں۔ ہماری اُردُو کا 'اولہ' بھی HOLA ہی ہے جس میں x (H) اور ا - (o) سے بدل گیا ہے۔

یورپ کے ماہرین لسانیات نے HAIL اور دوسری زبانوں میں اسی کے مترادفات کے ماخذ کے بارے میں ایک بات تو یہ کہی ہے کہ ان کا ماخذ تاحال تحقیق نہیں ہوسکا اور دُوسری بات یہ کہی ہے کہ غالباً HAIL (اولے) وغیرہ کا ماخذ HELL (دوزخ) کے ماخذ کے قریب ہے گویا اہلِ یورپ کا خیال ہے کہ HAIL (اولہ) اور HELL (دوزخ) کا ایک ہی ماخذ ہے۔ سو آیئے پہلے HELL (دوزخ) کے ماخذ کی تلاش کریں۔

دوزخ ـــــــ دوزخ کے لیے انگریزی میں HELL۔ کا کلمہ ہے جو اینگلو سا کسن کے HEL سے ماخوذ ہے۔ ڈچ میں HEL جرمن میں HOLLE اور لاطینی میں CELO ہے۔ اس کے اصلی معنی ہیں A PLACE OF CONCEALMENT یعنی خفیہ مقام۔ چھپانے یا چھپنے کی جگہ تاریک مقام، قید خانہ۔

لطیفہ: یہ ایک قسم کا لطیفہ ہے کہ یورپ والوں نے جہنّم کے لیے جو کلمات اپنائے ہیں اُن میں چھپانے کا مفہوم ہے جبکہ عربی میں بہشت کے مفہوم میں مستعمل کلمہ جَنّتِ کا مفہوم پوشیدگی اور چھپ جانا یا "چھپانا" ہے۔

خود ـــــــــــ فولادی ٹوپی جو دشمن کے وار سے سر کو بچاتی ہے اسے ہم خود کہتے ہیں۔ اور اہلِ یورپ نے اس کے لیے HELMET کا کلمہ اپنایا ہے۔ یہ لفظ بھی اسی دوزخ والے HELL اور HEL سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چھپانا۔ یہاں بھی دوزخ اور بہشت والا لطیفہ ہے کہ اہلِ یورپ نے سر کو بچانے والے خود کو HEL۔ یعنی چھپانے یا دوزخ سے لیا ہے۔ جبکہ عربوں نے پورے جسم کو دشمن کی وار سے بچانے والی ڈھال کو۔ جَنّ۔ (چھپانے) یا جنّت (بہشت) سے اپنایا ہے۔ عربی میں ڈھال کو "جُنّۃ" کہتے ہیں جس کا ماخذ "جن" ہے۔ اور مفہوم پوشیدگی اور چھپانا ہے اور جس سے "جنّت" کا لفظ ماخوذ ہے۔

گڑھا (سوراخ) ـــــــــ سوراخ یا گڑھے کے لیے انگریزی میں HOLE۔ سویڈش میں HAL ڈینش میں HUL اور نارویجن میں HULL۔ جرمن میں LOCH۔ (لوخ) ہے۔ جو ہمارے خول کا قلب (الٹ) ہے۔ یہ ایک قاعدے کی بات ہے کہ بعض اوقات لفظ ایک زبان سے دوسری زبان میں جا کر الٹ ہو جاتا ہے۔ اس قاعدے کی طرف اس سے پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں اور بعد میں تفصیل سے عرض کریں گے۔ انشاء اللہ۔

ہاں تو بات HOLE۔ اور HAL۔ وغیرہ کی ہو رہی تھی۔ اہلِ یورپ کا خیال ہے کہ انہوں نے یہ کلمات اینگلو سا کسن کے لفظ HOL سے لیے ہیں جس کے خالی، سوراخ یا چھپانے کے ہیں۔

حاصل کلام ۔ اولہ (ژالہ) HAIL اور دوسری زبانوں میں اس کے مترادفات کا ماخذ اینگلو سا کسن کا HEL ہے۔ یہی HEL دوزخ یعنی HEL اور خود یعنی HELMET کا روٹ (ROOT) ہے۔ سوراخ یا گڑھا کا مترادف HAL اور HULL یا HUL بھی اسی دوزخ والے HELL یا اولے والے HAIL سے لیا گیا ہے۔

ان سب کلمات کے معنوں میں تنہائی، پوشیدگی اور خوف کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اہلِ یورپ نے بارش کے دیوتا کے غضب سے ڈر کر اولے یعنی ژالہ باری کے لیے HAIL کا لفظ اختیار کیا اور پھر دوزخ کے لیے اس کے خوف و ہشت اور ویرانی کے پیشِ نظر HELL وغیرہ کلمات مستعار لیے اور ان تمام کلمات کے ماخذ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ عربی میں "ھول" ان سب کا ماخذ موجود ہے جو معناً اور صورتاً ان تمام کلمات کی اصل ہے۔ اسی پر بس نہیں بہت سے دوسرے کلمات بھی "ھول" سے ماخوذ و مشتق ہیں۔ مثلاً HALL (بڑا کمرہ) جو اینگلو سا کسن میں HEAL اور HEALL۔ آئس لینڈ کی زبان میں HOLL۔ سویڈش میں HALL اور ڈچ میں HAL ہے۔ ان کا

ماخذ اہلِ یورپ کی اپنی تحقیق کے مطابق وہی ہے۔ جو HELL (دوزخ) کا ماخذ ہے اور عربی میں "ھول" ہے۔

قاعدہ ــــــــــ اوپر سوراخ کے عنوان کے تحت جرمن کے LOCH - (لوخ) کے بارے میں عرض کیا تھا کہ یہ لفظ "خول" کو بدل کر "لوخ" بنایا گیا ہے۔ جرمن میں LOCH - کے معنی - HOLE - یعنی سوراخ کے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح اور مسلّم ہے کہ جرمن اور انگریزی دونوں زبانیں ایک ہی شاخ سے پھوٹی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ یورپ نے انگریزی وغیرہ کے HOLE اور جرمن کے LOCH کو ہم ماخذ قرار دیا ہے۔ اس طرح گویا اہلِ یورپ نے یہ بات خود مان لی ہے کہ LOCH - دراصل CHOL - ہے اور اگر ہم جرمن کے LOCH کو - CHOL - مان کر اسے عربی کے "خلو" سے ماخوذ مان لیں تو لسانیات کا کوئی قاعدہ قانون ہمارے اس خیال کی تردید نہیں کرتا۔ "خلو" سے خلاء، اور خالی کے کلمات بن کر ترکی، فارسی اور اردو میں آسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ CHOL (خول) کی صورت میں یورپ تک نہ گئے ہوں اور یورپ والوں نے جہاں دوسرے لوبہت سے کلمات میں حروف کو آگے پیچھے کر کے ان کی صورتیں مسخ کر دی ہیں وہاں CHOL (خول) کو (LOCH) لوخ نہ بنا لیا ہو۔

جب کسی کلمہ کے حروف کی ترتیب کو اس طرح بدل دیا جائے کہ پہلا حرف بعد میں اور بعد کا پہلے ہو جائے تو اسی "قلب" یعنی کلمہ کے حروف کی ترتیب کو الٹ دینا کہتے ہیں۔

اہلِ یورپ نے اپنی ہی زبانوں میں بے شمار کلمات کے حروف کی ترتیب کو الٹ دیا ہے۔ مثلاً اطالوی زبان میں سیب کو MELA کہتے ہیں اور ہنگری میں M کے بعد E کو A میں بدل کر M سے پہلے لے آئے ہیں۔ چنانچہ ہنگری زبان میں سیب کو ALMA کہتے ہیں اور ہمارے ترک بھائیوں نے تو E کو A سے بدلنے کا تکلف بھی نہیں کیا اور E ہی کو اس کے مقام سے بدل کر لفظ کے شروع میں رکھ دیا ہے۔ یعنی ELMA۔ اسی طرح انگریزی، جرمن اور ڈچ وغیرہ زبانوں میں بازو کے لیے ARM کا لفظ ہے جو پولینڈ میں RAMIE بن گیا ہے اور "سیربوکروٹ" یعنی یوگوسلاویہ کی زبان میں انگریزی وغیرہ کا ARM (آرم) RAME بن گیا ہے۔ سویڈن والے موصلی سفید کو SPARRIS کہتے ہیں اور فن لینڈ والوں نے شروع کے S کو R کے بعد کر دیا ہے یعنی PARSA۔

ڈاڑھی کے لیے پولینڈ والے BRODA اور سیربوکروٹ یعنی یوگوسلاویہ والے ڈاڑھی کو BAARD کہتے ہیں۔ یعنی R جو حرف علت سے پہلے تھا اسے حرف علت کے بعد کر دیا ہے اور

ہالینڈ والوں نے R کو حرفِ علت کے بعد کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور تبدیلی بھی کی اور وہ یہ کہ B۔(ب) کو P (پ) اور D (د) کو T (ت) سے بدل ڈالا ہے اور یوں یہ لوگ ڈاڑھی کو PARATA کہتے ہیں۔
تھیلے کو ناروین میں SEKK (سیک) اور انگریزی میں CASE (کیس) اور ترکی میں KESE بولتے ہیں۔ درجہ کے لیے انگریزی میں DEGREE۔ فرانسیسی میں DEGRE۔ (ڈگری) ہے۔ اور ہسپانوی اور اطالوی زبانوں میں اس لفظ کے حروف میں قلب کر کے GRADO۔ بنالیا گیا ہے۔ جو جرمن میں GRAD ہے۔ یعنی D (ڈ) کو R (ر) کے بعد کر دیا گیا ہے۔

عربی : اہلِ یورپ کا DEGRE - DGREE اور اس کا قلب GRADO اور GARAD۔ عربی میں 'درجہ' ہے ج کو G سے بدل کر G کو گ کی آواز دے دی گئی ہے۔ حالانکہ G کی آواز ج بھی عام مستعمل ہے۔

قاعدہ : قلب کی ایک دُوسری صورت بھی ہے یعنی لفظ تو وہی ہے لیکن معنی کو اُلٹ دیا گیا ہے۔ مثلاً عربی میں بسط کے معنی ہیں پھیلانا۔ پھیلاؤ، کشادگی وغیرہ۔ اور فارسی میں بست کا مفہوم الٹ گیا ہے یعنی باندھنا۔ بند کرنا، پھیلاؤ یا کشادگی کا الٹ۔ ہمارا ہندی اور اردو کا "پانی" یورپ میں روٹی بن گیا ہے۔ فرانسیسی کو روٹی کو PAIN - ہسپانوی میں PAN اسپرانتو میں PANO — اور اطالوی میں PANE کہتے ہیں۔ ہمارا مور" فارسی میں "مار" ہو کر سانپ بن گیا ہے اور فارسی کا موش (چوہا) یورپ کی زبانوں کی نمائندہ زبان اسپرانتو میں MUSO۔ (موش) مکھی بن گیا ہے۔ MUSO کے آخرہ حرف اسم ہونے کی علامت ہے۔ اصل لفظ MUS (موش) ہی ہے۔

مختصر یہ کہ قلب کی دو صورتیں ہیں :۔

ا۔ پورے لفظ (کلمہ) میں حروف کی ترتیب کو بدل دیا جائے۔

۲۔ لفظ وہی رہے معنی الٹ دیئے جائیں۔ اس قاعدے کی روشنی میں بہت سے کلمات کے ماخذ صاف اور نمایاں ہو کر نظر آنے لگ جاتے ہیں۔

قدرت : بات ژالہ (اولہ) سے شروع ہوئی تھی اور اس کی ذیل میں بہت سے دوسرے کلمات زیرِ بحث آگئے۔ اہلِ یورپ نے ژالہ کے لیے جو کلمات اپنائے ہیں وہ ڈر، خوف، ویرانی اور بیتابی کے مفہوم کے حامل ہیں۔ دوزخ کے لیے HELL اور HEL وغیرہ کلمات میں بھی خوف اور بیتابی کا مفہوم ہے۔ عربی میں ژالہ یعنی HAIL کے لیے "بَرَد" کا لفظ ہے جس کے مفہوم میں ٹھنڈک برودت اور سردی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ بات شروع میں عرض کی جاچکی ہے کہ اولے (ژالہ) ٹھنڈک اور سردی کی پیداوار ہیں۔ اس بات میں

ہمارے لیے غور و فکر کا ایک پہلو نکلتا ہے اور وہ یہ کہ عرب کے لوگ بھی اہل یورپ کی طرح اوہام پرست تھے۔ نیز یورپ میں ژالہ باری (HAIL) آئے دن کا معمول ہے۔ سرد علاقے میں برف اور اولے اکثر گرتے ہیں اس لیے اہل یورپ کو اولوں یعنی HAIL سے مانوس ہوجانا چاہیئے لیکن انہوں نے اس مفہوم میں خوف اور ڈر کا مفہوم شریک کیا ہے اور عربوں نے اولے کی اصل حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ جس وقت اور جس زمانے میں عربوں نے بَرَدٌ کا لفظ اولے کے لیے پہلی بار استعمال کیا تھا اس وقت اور اس زمانے میں عربوں کو یہ شعور نہ تھا کہ اولے سردی اور ٹھنڈک کا نتیجہ ہیں۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عربی زبان قدرت اور نیچر (NATURE) کی ترجمان ہے۔

اسی طرح ایک اور عربی لفظ "قلب" (دل) ہے جس کے معنوں میں تبدیلی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور عربوں نے پہلی بار جب دل (HEART) کے لیے "قلب" کا لفظ استعمال کیا تھا اس وقت وہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ جسم کا یہ مرکزی عضو یعنی دل یا قلب پورے جسم انسانی میں خون کی تبدیلی اور اس کے دوران یعنی (CIRCULATION OF BLOOD) کا ذریعہ ہے اور یہ جو کہا گیا ہے دل کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ جسم میں الٹا لٹکا رہتا ہے سو اس میں بھی عربی کے نیچر کی ترجمان ہونے کا اشارہ ہے۔ اس لیے کہ عربوں نے جسم انسانی کا اپریشن کرکے دل کے الٹا لٹکا ہوا ہونے کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ پہلے انہوں نے دل کو قلب کا نام دیا اور بہت بعد انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ (دل) الٹا لٹکا ہوا ہے۔

خون ——— خون جو عربی اور عبرانی میں دم DAM ہے اس کے لیے انگریزی کلمہ BLOOD۔ جرمن میں BLUT۔ ڈچ BLDED۔ سویڈش، ڈینش اور نارویجن میں BLOD۔ اور جرمنی کے مہاجر یہودیوں کی زبان YIDDISH (یہودی) BLUSE۔ افریقہ کی سواحلی زبان میں خون کے لیے عربی کا لفظ DAMU (دامو) مستعمل ہے۔

اہل یورپ نے اس لفظ یعنی BLOOD اور BLUT وغیرہ کے ماخذ کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ BLOOM یعنی شگوفہ، کلی اور BLOW بمعنی پھول یا شگوفہ کا کھل جانا وغیرہ کلمات کا اہم ماخذ ہے۔ گویا BLOOD بمعنی خون اور BLOOM بمعنی شگوفہ ایک ہی ماخذ سے لیے گئے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ BLOOD (خون) اور BLOOM (شگوفہ) میں قدر مشترک کیا ہے ؟ اور کیا وجہ ہے کہ خون کو شگوفہ یا شگوفہ کو خون سے مربوط اور متعلق خیال کیا گیا ہے ؟ اس سوال کا

جواب یورپ کے محقق حضرات نے یہ دیا ہے کہ شگوفے کا رنگ شوخ ہوتا ہے اور خون بھی سُرخ اور شوخ رنگ کا ہوتا ہے۔ اس لیے رنگت کے پیشِ نظر خون کو شگوفہ سے مستعار لیا گیا ہے۔ غرض خون سے متعلق کلمات BLOOD وغیرہ کا ماخذ BLOOM ہے۔ جس کے معنی ہیں شگوفہ۔ عربی میں بَلَّۃٌ کے معنی ہیں شگوفہ۔ شگوفہ۔ کلی۔ تر و تازہ جو بلٌّ اور بَلَلٌ سے ماخوذ ہے جس کی ایک صورت بُلَالَۃٌ ہے جس کے معنی ہیں تری۔ نمی یا تر و تازہ ہونا۔

صحت ——— خُون کے ہم معنی یورپی زبانوں کے بعض کلمات کے ماخذ کی نشاندہی کے بعد چند دُوسرے کلمات ملاحظہ فرمائیں۔ فرانسیسی میں خُون کو SANG کہتے ہیں جس کے آخر میں G کی آواز ہے اور یوں SANG کا تلفظ (سان) ہے۔ اسی طرح ہسپانوی میں خُون کو SANGRE۔ اطالوی اور پُرتگالی میں SANGUE۔ رومانوی میں SINGE اور اسپرانتو میں SANGO کہتے ہیں۔ ان تمام کلمات کا ماخذ لاطینی زبان کا کلمہ SANUG۔ ہے جس کے اصل معنی ہیں صحت تندرستی یا حفاظت اور محفوظ۔ اس مفہوم کے لیے عربی میں لفظ "صون" ہے۔ جس کے معنی ہیں حفاظت اور بچاؤ کرنا۔ صحت کا خیال رکھنا۔ اور مصون۔ یعنی محفوظ تو ہمارے اردو میں عام استعمال ہوتا ہے جو عربی کے اسی کلمہ صون سے لیا گیا ہے۔ جو فعل ماضی کی صورت میں صان ہے۔ وہی صَانَ انگریزی کے کلمہ SANITARIUM (دارالصحت) اور اسپرانتو کے کلمہ SANNA۔ (تندرست) یا SANO۔ صحت میں نظر آرہا ہے۔

خُون کا صحت سے جو تعلق ہے وہ وضاحت کا محتاج نہیں۔ اس لیے بعض یورپی اقوام نے عربی کا صَون یا صَانَ صحت اور تندرستی کے معنوں میں اور بعض نے خون کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اہلِ یورپ نے SOUND بمعنی تندرستی اور محفوظ کو بھی اسی لاطینی زبان کے کلمہ SANUS بمعنی صحت ماخوذ قرار دیا ہے جس کا عربی ماخذ صون یا صَانَ ہے۔

SOUND (صحت) کے لیے فرانسیسی میں SAIN۔ ہسپانوی اور اطالوی میں SANO جرمن میں GESUND۔ یہودی میں GESUND۔ ڈچ میں GEZOND۔ اور ڈینش میں SUND۔ ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ڈاکٹر مرزا سعید الظفر چغتائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پیرانہ سال مارکسم رُڈین سون[1] فرانس کے مشہور عالم اور سماجیات کے ماہر ۱۹۶۶ء میں "اسلام، قومیت اور اشتراکیت" کے موضوع پر پیرس کے کلب دے کاتروان[2] (چاروں ہواؤں کا کلب) میں گفتگو کے دوران کہنے لگے "بولوار سیں مشل پر اگر تمھیں اوسط قد کا کوئی معمر شخص، سوٹ میں ملبوس، کھچڑی داڑھی والا، اونی ٹوپی پہنے پُر وقار چال سے ماحول پر ہمدردانہ نیم متبسم نگاہ ڈالتا ہوا گزرتا مل جائے تو سمجھ لو ڈاکٹر حمید اللہ ہیں[3]۔ اگلے وقتوں میں جو ولی اللہ (سینٹ) ہوا کرتے تھے، اُن کا آخری نمونہ یہی ہے۔" سوربون میں رُڈین سون ڈاکٹر صاحب موصوف کے ہم سبق بھی رہے ہیں۔

الجزائری جنگ آزادی کے پُر ہول زمانہ میں ادنیٰ سے شُبہ پر فرانس میں کوئی بھی شخص گرفتار ہو سکتا تھا اور پھر اس پر وہ تمام مظالم کیے جاتے جو فرانسیسیوں نے جنگ عظیم ثانی

---

1 MAXIM RODINSON

2 CLUB DES QUATRE VENTS

3 ڈی لٹ (پیرس) پی ایچ ڈی (بون یونیورسٹی) سابق استاد، عثمانیہ یونیورسٹی

کے دوران نازیوں سے سیکھے تھے ۔ ایک دن ڈاکٹر حمید اللہ کے دروازہ کی گھنٹی بجی، کھولا تو ایک فوجی پوری یونیفارم میں کھڑا تھا ۔ آپ ڈرے، وہ اجازت لیکر اندر آیا اور کہنے لگا "پچھلے کچھ دنوں سے الجیریا میں شقاوت اور بربریت کے اتنے مظاہرے دیکھنے میں آئے ہیں نہ صرف اپنے ہموطنوں کی قومیت بلکہ اُن کے مذہب سے بھی مجھے نفرت ہوگئی ہے ۔ بمشکل اپنا تبادلہ جرمنی کرایا یا ہوں ۔ اثنائے راہ میں چند گھنٹے پیرس میں ملے ۔ مسجد سے آپ کا پتہ پوچھ کر سیدھا چلا آرہا ہوں ۔ مظلوموں کی اس سے زیادہ کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی کہ ان کا دینی بھائی بن جاؤں ۔ مہربانی فرما کر دستگیری فرمایئے اور اتنی دیر میں جو ضروری باتیں ہوسکیں بتادیجئے ۔"

میں فروری ۱۹۶۳ء میں پیرس پہونچا تو موصوف اپنے سالانہ پروگرام کے مطابق استانبول میں تین مہینے درس دینے جاچکے تھے ۔ کئی ماہ بعد ملاقات ہوئی تو میں اندلیشہ ہائے دور و دراز میں گھر چکا تھا اور تلخئ دوراں سے خاصا لذت آشنا ہوچکا تھا ۔ لیکن اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ہندوستان واپس آنے تک برابر نیاز حاصل رہا ۔ اور ان کی علمیت، اُصول پرستی، انسانیت دوستی، کمالِ اخلاص، شفقت، انکسار، کم گفتاری اور چھپ کے اپنی شخصیت پر پردہ ڈال کے بے لوث، بے غرض نیکی کے مظاہرے قدم قدم پہ دیکھتا رہا ۔

کئی بار زمین دوز ریل (مترو) میں ہم سفری میسر آئی لیکن جلد ہی ہم لوگوں نے اُن کے ساتھ مترو میں نہ داخل ہونے کی کوشش شروع کردی ۔ ان کی بزرگی کے پیش نظر اُن کے آگے کون چلتا ۔ وہاں کے قاعدہ کے مطابق ٹرین میں داخل ہوتے ہی ٹکٹ چک کرا لیتے ہیں اور ایک تاریخ اور وقت پڑا ہوا ٹکٹ فی کس پورے پیرس میں کہیں کے ایک سفر کے لئے کافی ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب داخل ہوتے وقت اپنے ٹکٹوں کا کتابچہ خالی کرکے سارے رفیقوں کو مفت داخل کرا دیتے ۔ خود ٹرین میں سارے وقت کھڑے رہتے اس لئے کہ بنچیں کم ہوتی ہیں اور اُن پر بیٹھنے کے زیادہ مستحق بچے، عورتیں، مریض، کمزور اور معذور

ہوتے ہیں جو اکثر سفر کرتے ہیں۔"

موصوف بڑے راسخ الاعتقاد اور مسلم علمی، ثقافتی تحریکوں کے پر جوش حامی اور اور سرپرست ہیں۔ "میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو" کا الزام ان کے سر نہیں آتا۔ تحقیق کرتے ہیں، تاویل نہیں۔ میرے ایک پاکستانی دوست لئیق احمد بابری نے پیرس کے لاتعداد آثار قدیمہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے "جب تک طالب علم تھا صرف ایک اثر قدیم سے واقف تھا اور وہ ہے قومی کتب خانہ (ببلیو تک نسیونال[۴]) اپنی ہمہ تن باخبری کے باوجود طالب علمی اور انہماک کا اب بھی یہی عالم ہے۔

یہ یوسف دامن تمام عمر مجرد رہے، مگر طبیعت میں سختی، تشدد، نوجوان دشمنی کے برعکس محتاط مزاجی اور شگفتگی دیکھی۔ مسلم طلباء کی انجمن میں سماجی، ثقافتی، جغرافیائی، تاریخی اور معاشی مسائل پر گفتگو میں پابندی سے حصہ لیتے۔ ایک دن میں نے شکایت کی کہ "بہت کم لوگ آتے ہیں" تو مسکرائے اور بولے "لوگوں کو بہت سے کام ہوتے ہیں" یہ نکتہ ہم لوگ بخوبی سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب پڑوسیوں سے اچھے تعلقات رکھنے کے بڑے داعی ہیں۔ کرسمس کے موقع پر دوسروں کے نام سے بے بضاعت یکہ و تنہا معمر عیسائی عورتوں اور مردوں کو تحفے بھجواتے رہتے تھے۔ آخر ش راز کھل گیا اور ایک پادری نے کلب میں کرسمس کی سالانہ تقریر کا موضوع "عیسائیوں کے لئے ایک برگزیدہ مسلمان کا جذبۂ مواخات بنایا۔"

حمید اللہ قیام فرانس اور سوربون کی تعلیم کے باعث طبعاً زیادہ تر فرانسیسی میں لکھتے ہیں اور اُن کی ہر کتاب سند اور حوالہ کا حکم رکھتی ہے۔ قرآن شریف کے بہت سے ترجمے فرانسیسی میں موجود تھے آپ نے خالص مسلم نقطۂ نگاہ سے ترجمہ کرکے چھاپنے کی اجازت اور

---

۴ BIBLIOTHEQUE NATIONALE

امداد یونسکو اور فرانسیسی کے قومی تحقیقاتی ادارہ (سے ان ار اِس ش) سے لی اور اُس کے مقدمہ پر دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کے ان تمام مکمل یا جزوی ترجموں کی فہرست کا اضافہ کیا۔ جن کی انھیں اطلاع مل سکی۔ ان کی ذاتی کتابوں میں بیسیوں زبانوں کے ترجمے موجود ہیں اور وہ سبھی یوروپی عالموں کی طرح اپنی معلومات کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔

حمید اللہ صاحب سات آٹھ زبانیں: اردو، انگریزی، فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی اور جرمن بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ اور ایک ہی نشست میں مختلف احباب کی ترجمانی اُن مختلف زبانوں میں کرتے ہیں۔ میں نے انھیں دیکھا ہے خیال ہوتا ہے کہ رسم خط سے شُد بُد انھیں پندرہ بیس زبانوں سے ضرور ہوگی

ڈاکٹر صاحب فرانسیسی پر ایک بہت مفصل اور ضخیم تحقیقی کتاب کے مصنف ہیں۔ انصاف محبت اور نگاہ کی گہرائی چاہیئے تو اُسے پڑھے اور بحثے۔ دوسری زبانوں والے شاید اس سے واقف نہیں۔

"اسلام کے تعارف" پر آپ کی کتاب اپنے اختصار کے باوجود اتنی جامع اور معلومات افزاء ہے کہ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے اور ڈاکٹر صاحب اپنے پڑھنے والے سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انھیں ترمیم و اضافہ کے لئے مشورہ دے۔

حمید اللہ صاحب نے ایک بار بعض علمی تحقیق کے لئے حکومت سعودی عرب سے اجازت چاہی، جس کا استانبول کے سعودی سفارت خانے سے یہ جواب ملا کہ "ہمارا ملک سیاحی کے لئے نہیں ہے۔ صرف حج یا عُمرہ کے لئے ماہ ذی الحجہ اور رجب میں ویزا ملتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب اس جواب سے بڑے افسردہ ہوئے۔ اس کا ذکر آتا تو کہتے کہ "مسجدِ حرام کا راستہ بند کرنے کی بات تو قرآن میں ابوجہل کے لئے آئی تھی۔"

رویتِ ہلال کے جھگڑوں سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن مسلم دنیا میں تاریخیں برابر قمری ہجری تقویم کے مطابق لکھی جاتی رہی ہیں اور انھیں بین الاقوامی عیسائی کیلنڈر کے مطابق لکھنا مورخوں کا مستقل دردِ سر رہا ہے اور ہے۔ چنانچہ ہجری و عیسوی تاریخوں کی مطابقت (کونسی ڈنس) پر تمام علمی دنیا میں کام ہوتا رہا اور عاجز آکر کوئی ناقص اصول اختیار کر لیا گیا۔ بعض جنتریوں میں یہ بیان ملتا ہے کہ باری باری سے ہجری سن کا ایک مہینہ ۲۹ کا اور دوسرا ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے روسی، ہسپانوی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبان کی مطابقتی جنتریاں جمع کر کے تحقیق کی اور سب میں یہی عیب پایا۔ بالآخر ٹورنٹو کی بین الاقوامی کانفرنس میں ان کی یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی کہ یہ کام ناقص ہے اور از سرِ نو کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کسی ہیئت داں کی خدمات کے منتظر تھے جو حساب لگا کر بتائے کہ پچھلے چودہ سو برس میں کس مہینہ اور کہاں چاند انتیس دن پر نکلا اور کہاں تیس دن پر۔ معلوم نہیں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ ہیئت کی رُو سے ان جھگڑوں کا فیصلہ نہ کر کے ہمارے علماء، نہ جانے کب تک مسلمانوں کی راہ میں کانٹے بوتے رہیں گے۔

مسلمانوں کے سماجی، نجی اور مذہبی معاملات کے بارہ میں ڈاکٹر حمید اللہ جمال الدین افغانی کی اس انقلاب انگیز رائے کے زبردست حامی ہیں کہ علماء اور فقہا کا بین الاقوامی بورڈ قائم کیا جائے۔ آپ کی نگاہ میں تنظیم کا یہ نقشہ ہے: ملک میں علماء کا ایک مرکز ہو۔ تمام استفتاء اسی کو بھیجے جائیں۔ یہ مرکز سوال نامے بین الاقوامی مرکز کو بھیج دے، جو قاہرہ، استانبول یا پیرس میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی دفتر سے سوال نامہ مختلف ملکی مرکزوں اور ان کے ذریعہ مشہور علماء کو بھیجا جائے۔ بین الاقوامی مرکز موصول شدہ جوابات کو مدوّن کر کے جمہوری رائے سوال کنندگان کو بھجوا دے۔ اس طرح جوابات تاریخی روشنی میں نمو پذیر ہوتے جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ جو جمہور علماء کا جواب آج موصول ہو دس سال بعد معاملہ اس کے برعکس رونما ہو۔ لیکن ہمیشہ عصری جواب کو فوقیت حاصل ہونا چاہئے۔

میرے خیال میں مذہب کی گرفت افراد پر سے ڈھیلی کر کے زمانہ نے یہ مسئلہ خود بخود حل کر دیا ہے۔ رہے اجتماعی مسائل، تو مختلف فرقے اختلاف بڑھانے کے لئے بنے ہیں۔ گھٹانے پر کیسے رضامند ہوں گے۔ اسی باعث حمید اللہ کی اس رائے کی کسی گوشہ سے تائید سننے میں نہیں آئی۔ مؤتمر عالمی کی تازہ ترین کوششیں شاید کچھ کام کر جائیں۔

حمید اللہ اسلامی دنیا پر انسائیکلوپیڈیائی معلومات کے حامل ہیں۔ مادام میورا وچ نے اقبال کے جاوید نامہ، پیام مشرق اور خطبات کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تو ایک ایک سطر حمید اللہ کے سامنے پڑھی اور متن سے ملائی۔ خود میرے ترجمۂ بال جبریل کے ساتھ انھوں نے ایسی ہی سخت محنت کی۔ مگر اس بات کے روادار نہ ہوئے کہ ہم تعارف میں ان کی نوازشات کا شکریہ ادا کریں۔

جرمن نژاد امریکی پروفیسر خاتون انا ماری شمل ابھی حال میں ہندوستان آئی تھیں، دہلی کے علاوہ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے رومی، اقبال اور ہندوستان کے مسلم تصوف پر چار لکچر دیئے۔ رومی پر ان کا مطالعہ زیادہ گہرا اور پرانا ہے۔ کتاب ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی سے شائع کی ہے۔ اقبال پر "بال جبریل" ہی کے نام سے انگریزی میں ایک بصیرت افروز کتاب شائع کر چکی ہیں۔ اس کا مجھے حمید اللہ صاحب کا ذاتی نسخہ فوراً پڑھنے کو مل گیا تھا اور معلوم ہوا تھا کہ لکھتے وقت فاضل مصنف نے اُن سے بڑی گفتگو اور خط وکتابت کی تھی۔ شمل خود بھی ہندوستان، مغربی ایشیا اور یورپ کی سولہ سترہ زبانیں جانتی ہیں۔ یہ کتاب دینے حمید اللہ صاحب بہ نفسِ نفیس ایک معمولی طالب علم کے کمرہ تک تشریف لے گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے اکثر خط وکتابت رہی اور رہتی ہے۔ ایک خط میں یہ گراں قدر مشورہ ملا جو سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے کہ "اپنی تحریر کو اپنے مزاج کی طرح سادہ بناؤ"۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ
اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝ وَاعۡتَصِمُوۡا
بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

MFTM-5-77

Asiatic

اعلیٰ بناوٹ

دلکشی وضع

دلفریب رنگ کا

حسین امتزاج

دنیا کے مشہور

SANFORIZED

REGISTERED TRADE MARK

سنفورائزڈ پارچہ جات

سکڑنے سے محفوظ

۲۰ ایس سے ۸۰ ایس کی سوت کی

اعلیٰ بناوٹ

گل احمد ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

ستار چیمبرز

۲۹- ویسٹ وارف کراچی

ٹیلیفون

۲۳۸۷۰۵ ، ۲۲۳۹۹۳

۲۲۵۶۳۹

تار کا پتہ :- آباد ملز

پاکستان انٹرنیشنل
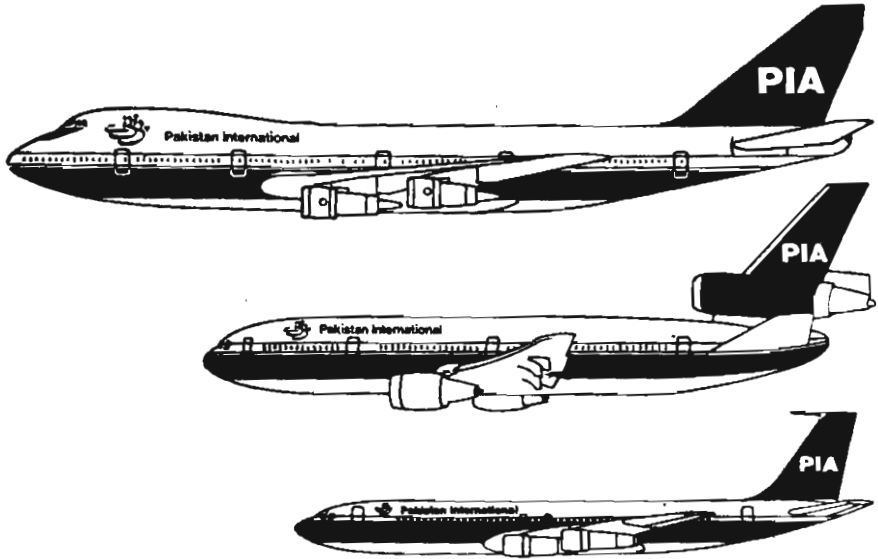
جو دیکھتے ہی دیکھتے لیگ کی صفِ اوّل کی ایئرلائنز میں شمار کی جانے لگی۔
اس مختصر مدت میں ایسی شاندار ترقی نے دُنیا کو محوِ حیرت کر دیا ہے۔
چنانچہ گذشتہ برس دُنیا کے ۷۵ مختلف شہروں سے ۲۲ لاکھ مسافروں نے
پی آئی اے سے سفر کیا۔
پی آئی اے کا فضائی بیڑا جدید ترین بوئنگ ۷۴۷، ڈی سی ۱۰ اور بوئنگ ۷۰۷ قسم کے
طیاروں پر مشتمل ہے جن کا دائرہ پرواز دُنیا کے چہار براعظم پر پھیلا ہوا ہے۔

مزید معلومات کے لئے براہ کرم اپنے ٹریول ایجنٹ یا پی آئی اے
بکنگ آفس سے رابطہ قائم کیجئے۔

IAL-IPP-18-77 RIO(K) PID

REGD-NO.P-90